تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد04 | شمارہ 02 | ماہ فروری 2019ء

سرپرست
محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
سید عبدالشکور
ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ اِنڈیا

Printed by Syed Abdul Shukoor and Published by Syed Abdul Shukoor
on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana,
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging ,
11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul,500 0 04 Hyderabad, T.S.
Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
**Ph: No.** 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

# قومی زبان


| | | |
|---|---|---|
| مدیر | : | سید عبدالشکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی |
| ناشر وطابع | : | سید عبدالشکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی |
| ترتیب وتزئین | : | محمد ارشد مبین زبیری |
| صورت گری | : | محمد جنید اللہ بیگ |
| سرورق | : | سید مجیب الدین |
| طباعت | : | طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد |
| ماہ | : | فروری 2019ء |
| جِلد | : | چہارم |
| شمارہ | : | (02) |
| استحقاق | : | تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں |
| مبادلہ ماہانہ | : | 15-00 (پندرہ) روپے |
| مبادلہ سالانہ | : | 150-00 (ایک سو پچاس) روپے |



قومی زبان ''میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

# قرینہ


| | | | |
|---|---|---|---|
| ہم کلامی | : | پروفیسر ایس اے شکور | 6 |
| **مضامین :** | | | |
| اُردو سفرنامہ | : | ڈاکٹر معید جاوید | 7 |
| دکنی ادب میں حکایت کی روایت | : | ڈاکٹر حمیرہ سعید | 11 |
| ''شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رواداری کے آئینہ میں'' | : | حلیم بابر | 14 |
| حضرت انوار منفرد لب ولہجہ کے نعت گو شاعر | : | سید محبوب قادری نظامی | 17 |
| راجا نرسنگھ راج عالی بحیثیتِ رباعی گو شاعر | : | ایس.ٹی.نور اللہ | 22 |
| مولانا محمد علی جوہر بے باک صحافی، عظیم مجاہد آزادی | : | شفیق اطہر جرنلسٹ | 25 |
| **گوشۂ خواتین :** | | | |
| اُردو ترجمہ قرآن کی پہلی مترجم خاتون ''محمود النساء بیگم'' | : | ہاشمی سید وہاج الدین | 31 |
| ہندوستانی سماج میں لڑکی کا مقام ومرتبہ | : | سیدہ سارہ سلطانہ | 35 |
| **معاشرت :** | | | |
| ویلن ٹائن ڈے | : | ڈاکٹر جاں نثار معین | 39 |
| **گوشۂ طلبا :** | | | |
| طلباء کی نشوونما میں استاد کا کردار | : | محمد ابراہیم خلیل سبیلی | 48 |
| غالبؔ بچوں کی محفل میں | : | حشمت کمال پاشا | 51 |
| **انشائیہ :** | | | |
| دعوت نامہ کا ایک انداز یوں بھی | : | اقبال مجید اللہ | 55 |
| **افسانے :** | | | |
| ماں کا دل | : | عابدہ محبوب | 60 |
| مسیحا | : | طٰہٰ آفندی | 64 |
| دل نے جسے چاہا | : | سعادت احمد | 67 |
| لختِ جگر کی خاطر | : | ثریا جبین | 74 |
| کہانی مل گئی | : | استوتی اگروال | 77 |
| **حصہ نظم :** | | | |
| غزلیں | : | صلاح الدین نیّر | 79 |
| غزلیں | : | ڈاکٹر سلیم عابدی | 80 |
| غزلیں | : | ڈاکٹر رؤف خیّر | 81 |
| غزلیں | : | جہانگیر قیاس | 82 |


oOo

# ہم کلامی

ماہ فروری کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے ۔ اس شمارے میں ممتاز ادیبوں' اسکالرس ومضمون نگاروں کے معلوماتی مضامین' اسی طرح خواتین اورطلباء کے گوشوں میں اُن سے متعلق مضامین کے علاوہ دلچسپ افسانوں اور حسب معمول شعرائے کرام کے کلام شائع کئے گئے ہیں ۔ امید کہ ان نگارشات سے قارئین کی معلومات اور دلچسپیوں میں اضافہ ہوگا۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی اپنے علمی وادبی سفر کے ساتھ ساتھ فروغ اُردو کی سالانہ اسکیمات کی عمل آوری میں مصروف ہے ۔ اکیڈیمی کی اسکیمات میں اُردو مصنفین کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت' فروغ اُردو کی جدوجہد میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنے والوں کے اعتراف میں دیئے جانے والے'' کارنامہ حیات ایوارڈ'' کا کام تکمیل کے مرحلہ میں ہے' جب کہ چھوٹے اُردو اخبارات کو سالانہ مالی اعانت کی اسکیم کی تکمیل ہوچکی ہے ۔

حکومت تلنگانہ نے ریاست میں اُردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کی عمل آوری کے لئے ریاستی وزرا' کلکٹر آفسوں اور دیگر اہم محکمہ جات میں (60) اُردو آفیسرس کا تقرر کیا ہے' ان آفیسرس کے ذریعہ دفاتر میں اُردو درخواستوں کے تراجم اور تلگو اور انگلش کی ضروری دستاویزات' مکتوبات اور دیگر لیٹرس کا اُردو میں ترجمہ کا کام لیا جارہا ہے' حکومت کے اس اہم اقدام سے ریاست میں اُردو کی ترقی کی راہ میں مدد ملے گی ۔ میری عوام الناس سے گزارش ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور دفاتر میں اپنی درخواستیں اُردو زبان میں داخل کریں ۔

اس کے ساتھ ساتھ اپنی نئی نسل کو اُردو زبان وادب سے واقف کروائیں' انہیں اُردو سکھائیں اور مدارس اور کالجس وغیرہ میں طلباء کو اُردو سبجیکٹ بھی لینے کی ترغیب دلائیں تاکہ نئی نسل میں اُردو باقی رہے ۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی کوشش بھی یہی رہے گی کہ اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے مزید نئی راہیں تلاش کی جائیں اور اس زبان کو موجودہ دور کے حساب سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی ہمسر بنایا جائے' اس کوشش میں ہمارے ادبا' شعراء اور محبانِ اُردو کا ساتھ ضروری ہے' اپنے مشوروں سے نوازتے رہیں' آپ کی قیمتی آراء کی قدر کی جائے گی ۔

ایس اے شکور

پروفیسر ایس اے شکور
ایڈیٹر

ڈاکٹر مُعید جاوید
صدر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

# اُردو سفرنامہ

**تمہید:** سفر انسانی زندگی کا ایک لازمی حصّہ ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے کسی نہ کسی طرح مختصر یا طویل مسافت طئے کر کے اپنے کام انجام دیتا ہے اور اسی طرح دنیا کا نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ سفر کو وسیلۂ ظفر یعنی کامیابی کا ذریعہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ سفر سراسر حرکت و عمل کا نام ہے اور یہی زندگی ہے ورنہ جمود و تعطل سے کامیاب زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ سفر کا شوق انسان کی فطرت میں بھی شامل ہوتا ہے۔ یہی وجہہ ہے کہ انسان اپنے مستقر یا ایک ہی مقام پر رہ کر بسا اوقات انقباض کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ کسی خوشگوار مقام کے سفر کو ترجیح دیتا ہے اور اس سفر سے لُطف اندوز ہوتا ہے اسی لئے دُنیا بھر میں عموماً خوشگوار مقامات پر سیر و تفریح کی خاطر دُور دُور سے آنے والے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ علاّمہ اقبالؔ نے دُرست ہی کہا ہے: ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

**اہمیت وافادیت:** سفرناموں کے مطالعے کے ذریعہ گراں قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے مطالعہ کے ذریعہ سفرنامہ نگاروں کے نظریات و خیالات کا جہاں علم ہوتا ہے وہیں اُن کے اُسلوبِ نگارش اور اندازِ تحریر کا بھی پتہ چلتا ہے، علاوہ ازیں ان کے مزاج و منہاج کی کیفیت، مُشاہدہ کی قُوّت اور علم و فن کی وسعت وغیرہ خوبیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

سفرنامے دراصل بیش بہا معلومات کا خزانہ فراہم کرتے ہیں۔ سفرناموں میں عموماً جغرافیہ، تاریخ، مختلف مقامات یا ملکوں کا موسم، حکومت و سلطنت، انقلاباتِ وقت، حکومتوں کا عروج و زوال، مختلف مقامات کی الگ الگ خصوصیات، قوموں کی تہذیب و ثقافت، تمدّن، طور طریقے، زبان اور بولیاں، طرز معاشرت، بود و باش، رہن سہن، کھانا پینا، رسوم و رواج، خیالات، میلانات اور رجحانات، صنعت و حرفت، مواصلاتی اسباب و ذرائع، تعلیمی حالات، ادارے و جامعات و دیگر خصوصیات اور سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ سفرناموں کے مطالعے کے ذریعہ گھر بیٹھے ان سارے موضوعات کا ذرک حاصل ہوتا ہے اس لئے سفرناموں کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور ایک کامیاب سفرنامہ کے لئے مندرجہ بالا خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

**تعریف:** ''سفر'' عربی لفظ ہے جس کے لفظی معنی مسافت طئے کرنے کے ہیں، علاوہ ازیں بعید اور بیاض یا سفید رنگ، کوچ کرنا اور نقل مقامی کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ سفر واحد لفظ اور اس کی جمع اسفار ہے۔ سفرنامہ ایک قدیم بیانیہ صنفِ ادب ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے نثر کی اصناف میں سے ایک صنف سفرنامہ بھی ہے۔اس صنف کے توسط سے نثر میں سفرنامہ نگار اپنے سفر کے دوران پیش آمدہ حالات' مشاہدات' تاثرات اور دیگر کوائف کو بیان کرتا ہے۔سفرنامہ کبھی دورانِ سفر ہی لکھا جاتا ہے اور کبھی سفرنامہ نگار ضروری معلومات اور حالات کو بھی مختصر طور پر یادداشت کے طور پر لکھ لیتا ہے اور سفر کے اختتام کے بعد اِن حالات و واقعات اور دیگر اہم مشاہدات وتاثرات کو ازسرِنو ترتیب کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔

**سفرناموں کی اقسام:** سفر کبھی علمی وادبی غرض کے لئے کیا جاتا ہے' کبھی سفر تاریخی وتحقیقی شان کا حامل ہوتا ہے۔کبھی صرف سیر و سیاحت یا تفریح کی غرض سے سفر کیا جاتا ہے اور اسی طرح تجارت' ہجرت' مقدس مقامات کی زیارت ودیگر اغراض ومقاصد کے لئے بھی سفر کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی تحقیقی کتاب ''اُردو سفرنامے انیسویں صدی میں'' ''سفرناموں کی اقسام'' کے عنوان کے تحت انیسویں صدی کے سفرناموں کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے یعنی (1) یورپ کے سفرنامے (2) مشرقی سفرنامے (3) مقامی سفرنامے اور (4) مذہبی سفرنامے۔اُردو میں سفرنامے ان ہی اقسام کے تحت تحریر کئے گئے ہیں۔ان کے علاوہ اُردو میں طنز ومزاح پر مشتمل سفرنامے بھی ملتے ہیں جیسے ابنِ انشاء کا ''اک ذرا تہران تک'' اور ''چلنا ہے تو چین کو چلیئے'' یوسف ناظم کا سفرنامہ ''کولمبس کے دیس میں'' اور مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' وغیرہ ہیں جن سے اردو میں طنز ومزاح پر مبنی سفرناموں کی روایت کو فروغ مِلا ہے۔سفر کی خود بھی کئی اقسام ہوسکتی ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

(1) مذہبی سفر (2) ادبی سفر (3) علمی سفر (4) تجارتی سفر (5) سیاسی سفر (6) شاہی یا حکومتی سفر (7) جنگی سفر (8) مہماتی سفر (9) سفر ہجرت (10) خیالی یا تصوراتی سفر (11) تفریحی سفر۔

**سفرناموں کی ہئیت:** اُردو میں جو سفرنامے تحریر کئے گئے ہیں وہ ہئیت کے اعتبار سے الگ الگ ملتے ہیں یعنی (1) بعض سفرنامے 'روزنامچہ' کی شکل میں تحریر کئے گئے' بعض سفرنامہ نگاروں نے ہر روز ڈائری کی طرح اپنے سفرنامے تحریر کئے ہیں اور اسی طرح ان کی اشاعت عمل میں لائی گئی جیسے پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' (2) بعض سفرنامے جو تفصیلی مضمون کی طرح لکھے گئے اور اسی طرح شائع بھی کئے گئے۔(3) بعض سفرنامے وہ ہیں جو باضابطہ سفرنامے کی حیثیت سے لکھے گئے یعنی جو خصوصیات وعناصر سفرناموں کے لئے ضروری ہوتے ہیں جیسے تاریخ' جغرافیہ' تہذیب و تمدن' ثقافت' اہم حالات' ملکی خصوصیات ودیگر مسائل بالخصوص مستنصر حُسین تارڑ کے سفرنامے اس کی بہترین مثال ہیں۔

**سفرناموں کی ابتداء:** سفرنامہ کی شروعات قصّہ' داستان اور کہانی وغیرہ سے ہوئی جس میں سفر کرنے والوں کے حالات اور واقعات بیان کئے جاتے رہے جیسے سند باد جہازی وغیرہ۔ دیگر اصناف کی طرح اُردو سفرنامہ بھی عربی و فارسی ہی کی دین ہے اگرچہ انگریزی ادب میں بھی اس موضوع پر وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

سفر کے آغاز وارتقاء کے سلسلہ میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی ابتداء تو روزِ ازل ہی سے ہوئی ہوگی البتہ جیسے جیسے آبادی بڑھتی رہی بتدریج ضرورتیں بڑھتی رہیں اسی

طرح سفر کے مرحلے بھی یقیناً آگے بڑھے ہوں گے اور پھر سفر کے الگ الگ اسباب و ذرائع وجود میں آئے اور نئے نئے مقامات دریافت ہوتے گئے جیسے واسکوڈی گاما ہندوستان کی تلاش میں امریکہ پہنچ گیا' پھر ہندوستان آیا' تعلقات بڑھتے رہے اور سفر کے دروازے کھلتے گئے۔

محققین نے یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس (Herodotus) کو اولین سفر نامہ نگار قرار دیا ہے۔ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کے تصنیف کردہ ''عجائبات فرنگ'' کو عموماً اُردو کا پہلا سفر نامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ ''تاریخِ یوسفی'' کے نام سے 30/مارچ 1847ء میں مکتبہ العلوم' دہلی سے شائع کیا گیا بعد ازاں 1873ء میں ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے مکتبہ نول کشور سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس عمومی خیال کے برخلاف ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب ''اُردو سفر نامے۔ انیسویں صدی میں'' اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ''مثنوی نادرؔ'' کو اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا ہے جو دراصل نواب آعظم جاہ والئ ارکاٹ کا سفر نامہ ہے جسے اُس زمانے کے شاعر نادرؔ نے منظوم کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۲۲۸ھ کا ہے' اس کے برخلاف ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب ''اُردو سفر نامے کی تاریخ'' میں ''اُردو کا پہلا سفر نامہ نگار کون؟'' کے عنوان سے قدرے تفصیل سے بحث کرتے ہوئے سید فدا حسین عرف نبی بخش کے سفر نامہ ''تاریخِ افغانستان'' کو اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار دیا جو 1939ء کا ہے اور اس سفر نامہ کو یوسفی کے سفر نامے سے بہرحال تقدم حاصل ہے' اسی لئے جدید تحقیق کے مطابق اب ''تاریخِ افغانستان'' ہی اُردو کا پہلا سفر نامہ قرار پاتا ہے۔

علاوہ ازیں اُردو زبان میں سرسید احمد خان کا ''مسافرانِ لندن'' اور ''سفر نامہ پنجاب''، محمد حسین آزاد کا ''سیر ایران''، شبلی نعمانی کا ''روم و مصر و شام'' اور مولانا عبدالحئ کا ''دہلی اور اس کے اطراف'' وغیرہ' اُردو سفر ناموں کی تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس بیانیہ صنفِ ادب میں مردوں کے دوش بدوش خواتین نے بھی اپنا حق ادا کرتے ہوئے بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے اُردو میں سفر نامے لکھنا شروع کیا' پہلا دستیاب سفر نامہ سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کا ''سفر نامہ حج'' 1905ء میں شائع ہوا جو کہ انہوں نے اپنے سفر حج کے دوران لکھا۔ ان کا ایک اور سفر نامہ ''سیاحتِ سلطانی'' ہے جو انہوں نے اپنے ایک عزیز کے علاج کے ضمن میں پیش آنے والے لندن کے سفر کے دوران 1911ء میں لکھا۔ بیگم حسرتؔ موہانی کا ''سفر نامہ عراق'' 1937ء میں لکھا گیا جو کہ ہندوستانی عورت کے مشاہدات اور محسوسات کا پُرلطف بیانیہ ہے۔ قرۃالعین حیدر کا سفر نامہ ''کارِ جہاں دراز ہے'' جس میں انہوں نے امریکہ کی سلور اسٹیٹ کے سفر کو بیان کیا ہے۔ دیگر خواتین کے سفر ناموں میں صغرا ہمایوں مرزا کے دو سفر نامے ''سفر نامہ یورپ'' اور ''سفر نامہ عراق''، صہبا لکھنوی کا سفر نامہ ''میرے خوابوں کی سرزمین''، بیگم صغرا مہدی کا ''مشاہداتِ بطوطی''، نوشابہ نرگس کا ''سفر کہانی''،

زبیدہ حی کا ''زہے نصیب''، پرتو روہیلہ کا ''گردِراہ'' اور نازلی رفیعہ سلطانہ کا ''سیر یورپ''، سلطان حیات کا ''ایک نامکمل سفر''، صالحہ عابد حسین کا ''کچھ دن المانیہ میں''، خالدہ ادیب خانم کا ''اندرون ہند'' وغیرہ سفر نامے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی سفر نامے ہیں جو اُردو میں تحریر کئے گئے ہیں جو نہایت دلچسپ اور مختلف معلومات سے معمور ہیں جن سے اُردو کا دامن مالا مال ہوا اور یہ سلسلہ نہایت رفتار کے ساتھ جاری ہے۔ المختصر میں اپنے اس مضمون کا اختتام اس شعر کے ذریعہ کرتا ہوں کہ: ؎

رہِ طلب میں کسے آرزوئے منزل ہے
شعور ہو تو سفر خود سفر کا حاصل ہے

## حوالہ جاتی کتب:


۱۔اُردو سفر نامے انیسویں صدی میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی کتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، فبروری ۱۹۸۷ء

۲۔اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور ینٹ پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۱۴ء۔

۳۔سفر روم ومصروشام، شبلی نعمانی رحمانی پریس، دہلی۔

۴۔سفر پنجاب مولفہ مولوی سید اقبال علی، علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۸۸۴ء۔

۵۔سیر ایران محمد حسین آزاد کریمی پریس لاہور، ۱۸۸۶ء۔

۶۔عجائباتِ فرنگ یوسف خان کمبل پوش، مطبع نول کشور لکھنؤ، باردوّم ۱۸۹۸ء۔

۷۔مسافرانِ لندن، سرسید احمد خان، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء۔


☆☆☆

## قبر کی مٹی

حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں جزیرہ کیش میں مجھے ایک سوداگر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے چالیس تو کارندے تھے اور ڈیڑھ سو اونٹوں پر مالِ تجارت لدا تھا۔ وہ ایک رات مجھے اپنی آرام گاہ میں لے گیا، مگر خیالی پکاؤ پکانے میں نہ تو رات بھر مجھے سونے دیا اور نہ خود سویا۔ کبھی کہتا میرا فلاں مال ترکستان میں پڑا ہے اور فلاں شئے ہندوستان میں رکھی ہے۔ کبھی سناتا کہ اسکندریہ چلیں وہاں کی آب وہوا بڑی خوشگوار ہے۔ پھر خود ہی کہہ دیتا کہ جائیں کیسے؟ کبھی کہتا کہ ''جس سفر کا میں نے ارادہ کر رکھا ہے اگر وہ پورا ہو جائے تو پھر عمر بھر ایک جگہ گوشہ عافیت میں بیٹھ کر قناعت سے بسر کروں''۔ میں نے پوچھا ''بتائیے وہ کون سا سفر ہے؟''۔ کہنے لگا ''فارس سے چین کو گندھک لے جاؤں گا، سنا ہے وہاں اس کی بڑی قدر وقیمت ہے اور چین سے پیالیاں خرید کر روم میں بیچوں گا اور وہاں سے اُن کے عوض رومی کپڑا خرید کر ہندوستان لے جاؤں گا۔ پھر ہندوستان سے ہندوستانی فولاد حلب میں پہنچاؤں گا اور اس کے بدلے آئینے خرید کر یمن لے جاؤں گا اور پھر یمنی چادریں اپنے وطن فارس میں لاکر مزے سے ایک دکان کھول کر بیٹھ جاؤں گا اور سفر کو خیر باد کہہ دوں گا''۔

ذرا اس جنون کو ملاحظہ فرمائیے۔ بس اس طرح بکتے بکتے اُس نے رات گزار دی، اتنی بکواس کی کہ اب بولنے کی طاقت نہ رہی۔ آخر اس نے میری طرف توجہ کی اور کہا ''شیخ صاحب آپ نے بھی دنیا دیکھی ہے، اپنے دیکھے سنے سے ہمیں بھی تو مشرف فرمائیے۔ میں نے کہا ''قبر کی مٹی'' ایسے انسان کا پیٹ بھر سکتی ہے۔

oOo

ڈاکٹر حمیرہ سعید
صدر شعبہ اردو، این ٹی آر گورنمنٹ ڈگری کالج (ویمن)

# دکنی ادب میں حکایت کی روایت

## (کلمتہ الاسرار کے حوالے سے)

بنی نوع انسان نے جب سے سماجی زندگی کا آغاز کیا ہے اور زبان، تہذیب وثقافت کے بتدریج ارتقائی عمل سے گذرتا رہا تو اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جو آگے چل کر الگ الگ فنون کی شکل میں سامنے آئے۔ چاہے وہ رقص وموسیقی ہو یا ادب کے ابتدائی اظہار کے وسیلے۔ جہاں تک بات اظہار کی ہے انسان نے کسی نکتہ، بات یا خیال کو یا کسی احساس کو دلچسپ انداز میں بیان کرنے کیلئے اُسے پراثر بنانے کیلئے قصہ گوئی کا سہارا لیا ہے۔ قصہ گوئی اور انسان کا ساتھ ابتداء سے ہی رہا ہے۔ غرض کہنے سننے کے اس عمل نے قصہ، کہانی، اساطیر اور حکایتوں کو پنپنے کا موقع دیا۔ پیرائے اظہار اور منفرد خصوصیات کی بناء پر قصہ گوئی کے الگ الگ نام دیئے گئے۔ داستان، ناول، ڈرامہ، افسانہ، مثنوی، رموزیاں، اساطیر، حکایت، کہانی وغیرہ۔ اب اگر ہم خالص حکایتوں کی بات کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکایت دراصل کسی بات کو سمجھانے کے لئے یا کوئی نصیحت دینے کیلئے بیان کیا جانے والا قصہ ہے، یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکایت دراصل ایک قصہ کے بیان کو کہتے ہیں جس میں کوئی اخلاقی پہلو نمایاں کیا جائے۔

جہاں تک دکنی ادب میں حکایتوں کی روایت کی بات آتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی ادب کا ابتدائی مقصد انسان کی علمی ومذہبی روحانی واخلاقی تربیت تھا۔ اس لئے جب ادباء، شعراء نے مختلف اصناف کے ذریعہ دکنی زبان میں تخلیق وترتیب کا بیڑہ اٹھایا تو اپنی بات کو واضح طور پر بیان کرنے کیلئے باآسانی لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کیلئے اپنی تحریروں میں جابجا حکایتوں کا سہارا لیا ہے۔ ان ہی برگزیدہ شخصیتوں میں ایک نام ہمیں ملتا ہے شاہ امین الدین اعلیٰ کا۔ امین الدین اعلیٰ، برہان الدین جانم کے فرزند تھے اور صوفیاء دکن میں ایک امتیازی مقام کے حامل۔ شاہ امین اور ان کے مریدوں نے دکنی نظم ونثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ ایک ایسی زبان کا جسے تحریر کیلئے قابل اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا) سہارا لے کر رشد وہدایت کے موثر ذریعہ اظہار بن گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر وفن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔ امین الدین اعلیٰ نے نثر میں بہت سے رسالے سپرد قلم کئے ہیں۔ گنج مخفی، رسالہ وجودیہ، گفتار امین الدین، ظاہر وباطن، عشق نامہ، شرح کلمہ طیب اور کلمتہ الاسرار۔ ان تمام میں انہوں نے اپنی تعلیمات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

شاہ امین کا رسالہ ''کلمتہ الاسرار'' ان کا سب سے

طویل نثری کارنامہ ہے۔ مراتب وجود کی تفہیم کیلئے انہوں نے تمثیلی اسلوب سے مدد لی ہے۔ ''کلمتہ الاسرار'' میں وہ نور محمدی کی حقیقت بیان کرنے کیلئے اور کلمہ کی تشریح توضیح کیلئے حکایتوں کی مدد سے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔

''کلمتہ الاسرار'' میں مرید پوچھتا ہے کہ کلمہ کے معنی کیا ہیں تو مرشد جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کلمہ کے ظاہری معنی الگ ہیں اور باطنی معنٰی الگ۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''کلمہ کا ظاہر کا معنا یوں ہے کہ نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ ہے ہور محمد بھیجے گئے اللہ کے ہمیں اس معنی کو برحق کہ جانن اور اللہ کو ایک کر ماننا تب ظاہر کا مسلمان ہوئے لیکن کلمہ کا باطن کا معنی ہور ہے جب تک اس باطنی معنی کوں نیئں سمجھا تب تلک باطن میں مسلمان نہیں ہوا۔''

شاہ امین فرماتے ہیں کہ صرف زبان سے اقرار کر لینا اور اس کے معنی اخذ کر لینا ہی ایک مسلمان کیلئے کافی نہیں ہے بلکہ انسان اپنی بصیرت سے جانے کہ کلمہ میں کیا کیا اسرار پوشیدہ ہیں اور ایک کلمہ کس طرح انسان کو تخلیق کائنات خدا اور رسول کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ جب مرید اصرار کرتا ہے کہ کلمہ کے باطنی معنی سمجھائیں تو کلمہ'' لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ'' کی لفظ بہ لفظ تشریح کرتے ہوئے مختلف مثالوں، تشبیہوں، استعاروں کے ساتھ حکایتوں کی مدد سے بھی امین الدین اعلیٰ نے نہایت خوبصورتی سے وضاحت کی ہے۔ وہ لفظ ''لا'' کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ارے بھائی ''لا'' کہتے ہیں نہیں کوں، اونہیں کیا ہے او سے سمجھنا بھی کہ لوکاں بولتے ہیں کہ اول عدم تھا۔ سو اوس عدم سوں سب عالم وجود ہوا ہور نابود میں سوں سب جہاں بود میں آیا تو اتنا معلوم کرنا کہ جیسی شئی میں سوں یو سب عالم پیدا ہوا تو اوس شئی کون نابود عدم کس وجہ جاننا۔ ارے بھائی چھلکا اچھا ہے تو اوس میں البتہ مغز نکلتا ہے اگر چھلکا نہ ہوئے تو مغز کہاں سوں باہر نکلے۔

اس ضمن میں لا کی تفہیم کرتے ہوئے شاہ امین نے جو حکایتیں پیش کی ہے وہ اتنی خوبصورت اور واضح ہیں کہ امین الدین اعلیٰ جو تشریح ''لا'' کی کرنا چاہتے ہیں وہ پڑھنے، سننے والے پر صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس حکایت کے علاوہ شاہ امین نے مثالوں، تشبیہوں و استعاروں کی مدد سے اس بات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ صرف اس حقیقت کے ذریعہ بات پہنچا دیتے تو بھی ''لا'' کے جو معنی وہ اپنے مرید کو سمجھانا چاہتے ہیں واضح طور پر اس پر عیاں ہو جاتے۔ وہ مچھلی کی حکایت پیش کرتے ہیں۔ حکایت کچھ اس طرح ہے کہ'' مچھلیاں ساری اس فکر میں رہتی ہیں کہ لوگوں کا ماننا ہے کہ مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ پانی میں ہی رہتی ہیں۔ پانی نہ ہو تو مچھلی تڑپ کر مر جاتی ہے۔ آخر یہ پانی ہے کیا اور ہے کہاں؟۔ سب مچھلیاں اپنی سردار مچھلی سے یہ بھید جاننا چاہتی ہیں'' تب سردار مچھلی ان سب سے کہتی ہے:

'' پانی تمنا کوں کیوں دستانئیں، تمہاری انکھیاں پر کا یکا پردا پڑیا ہے، تمہارا دل کدہر کوں گیا ہے ہور تمنا کوں کیسی غفلت نے گھیری ہے۔ جو ایسا پانی تمنا کوں دستا نہیں۔؟۔

ارے دیوانیاں ہو پانی تمہارے نیچے' اوپر' داوے' باوے' انگے پیچے تمہارے موں میں' تمہارے کان میں' انکھیاں میں' تمہارے سینے میں' دل وجان میں بہریا ہے۔لیکن تمنا کوں دستا نہیں' ایسا پانی کیوں نہیں دستا۔''

اتنا کہہ کر سردار مچھلی ساری مچھلیوں کو ایک جھٹکے سے پانی سے باہر پٹک دیتی ہے۔ پانی سے باہر ہوکر ساری مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں اور اس حقیقت کو جان لیتی ہیں کہ پانی کیا ہے۔ شاہ امین فرماتے ہیں کہ ٹھیک اسی طرح اللہ نے سب چیز ظاہر اور باطن کا احاطہ کیا ہے اور کوئی چیز اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔جس طرح مچھلی کی زندگی اور وجود کیلئے پانی ہر جگہ اہم ہے اُسی طرح اللہ ہر مقام پر ہمارے ساتھ ہے۔

اس حکایت کی وجہ سے شاہ امین کی تحریر میں ایک حُسن پیدا ہوگیا ہے اور بات بھی بالکل صاف۔ یہ حکایت اس نکتہ کو واضح کرتی ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔کلمۃ الاسرار میں ہی شاہ امین' نور محمدی کی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے سکندر اور نوشابہ کی حکایت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر فہم وفراست سے غور کریں تو پوشیدہ اسرار بھی عیاں ہوجاتے ہیں جس طرح سکندر کی اصلیت کو نوشابہ نے جان لیا ہے۔

نوشابہ اور سکندر کی حکایت میں شاہ امین بتاتے ہیں کہ کس طرح نوشابہ بھیس بدلنے کے باوجود سکندر کو پہچان لیتی ہے۔

''اپنی دانائی سوں معلوم کی کہ یوسوں ہور ہرکارہ نہیں یوں سکندر اپیچ ہے۔ پہر پوچھی کہ سچ کہوتوں کون ہے۔ ہور پیغام کس کو پونچاتا ہے۔سکندر نے وہی بولیاں کہ میں ہرکارہ ہوں اور پیغام سکندر بادشاہ کا پہنچاتا ہوں۔تب نوشابہ نے بولی کہ توں رسول اور قاصد نہیں معلوم ہوتا مگر سکندر بادشاہ ہے کہ اپنا پیغام اپنچہہ پہنچاتا ہے ۔ ردو بدل بہت ہوا ہے۔''

اس طرح شاہ امین کہتے ہیں کہ غور کرنے پر ہم اللہ اور محمدؐ دونوں کو پہچان سکتے ہیں۔

''ارے بہائی محمدؐ کوں رسول نہ جان عین اللہ چہ ہے کہ مان ہور اوس اللہ سوں لگا دہیان ہور یوں بات ہماری سانچ کر مان ہور جہاں میں یو وجود ہور جسد نظر آتے ہیں اونو بھیجے گئے اللہ کے رسولؐ پہچان بلکہ ے شک' بے شبہ صفات اللہ چہ کر بوجہہ۔''

ایک اور جگہ شاہ امین نور محمدی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ:

''ارے بہائی او حقیقت محمدیؐ سراپا نور ہے کہ اوس دریاؤ میں جیوں گلاب میں بوئی ہور جیوں دود میں گھیو ہے۔ یوں او نور محمدؐ اوس دریاؤ بیچوں بیچگوں میں بہر پور ہے۔''

الغرض شاہ امین الدین اعلیٰ کلمۃ الاسرار کے ذریعہ کلمہ کی آسان تفسیر وتفہیم کی جو کوشش کرتے ہیں ان حکایتوں کی وجہ سے وہ اور بھی آسانی سے واضح ہوجاتی ہے۔ سکندر ونوشابہ کی حکایت سے جہاں وہ نور محمدی کی حقیقت وانسانی بصیرت کے اطوار بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں ''لا'' کی اشاریت کو واضح کرنے کیلئے سمندر اور مچھلیوں کی حکایت پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

حلیم بابر
محبوب نگر

# ''شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رواداری کے آئینہ میں''

## ''تمام مذاہب کا رہنما و محافظ''

اسلام میں رواداری کو بڑی اہمیت وفضیلت حاصل ہے ۔اسلام ایک کھلا ذہن رکھتا ہے اور تنگ دلی وفرقہ پرستی کا کٹر مخالف ہے ۔اسلام وہ خوبیوں کا حامل مذہب ہے جس کی تعلیمات سے متاثر ہوکر ہزاروں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ دیگر ممالک بالخصوص امریکہ جیسے ترقی پسند ملک میں انگریز اسلام سے متاثر ہوکر ایمان لے آئے اور ایک ایک سنت کو بڑے احترام ودلجوئی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔انہیں دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے ۔اسلام کی عظمت تو ان لوگوں سے پوچھئے جو نومسلم ہیں' چونکہ مسلمانو ں کو ورثہ میں اسلام ملا ہے اس لئے وہ اس کی اتنی قدر نہیں کرتے جتنی کہ کرنی چاہئے ۔اسلام وہ مذہب ہے جس نے شہنشاہ وگداؤں میں فرق نہیں سمجھا۔اس خصوص میں علامہ اقبال کا یہ شعر عقل وفہم کو ایک جنبش دیتا ہے اور دعوت فکر بھی دیتا ہے کہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

ہندوستان میں مسلمانوں نے ہزاروں سال حکومت کی ہے اور اپنی عظمت ورواداری کے نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے اور رہتی دنیا تک ان کے صفات وکارناموں کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہندوستان کا مغل دور حکومت ایک یادگار زمانہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ۔اسی دور کے نامور حکمرانوں میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا نام آتا ہے جس نے مذہبی رواداری کی ایسی مثال قائم کی جس کی زمانہ مثال پیش نہیں کرسکتا۔اورنگ زیب نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی نظر میں برابر کا سمجھا چونکہ اس نے جہاں مسلمانوں کو جاگیر اور منصب عطا کئے وہیں ہندوؤں کو بھی اس سے نوازا۔تاریخ میں اورنگ زیب کے بارے میں الٹ پلٹ کر غلط انداز میں واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ان واقعات کو ہندو مورخین نے بھی نامناسب کہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے مندریں توڑیں' یہ انتہائی غلط ہے' چونکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اورنگ زیب نے رواداری کے پیش نظر ہندوؤں کی عبادت گاہوں پر بھی خصوصی توجہ دی ۔مندروں کی مالی اعانت کی ۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرح جاگیروں وعہدوں سے نوازا۔اسی طرح نظام دکن نواب میر عثمان علی خان کے دورِ حکومت میں بھی رواداری کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔ ہندوؤں کو مذہبی آزادی دی گئی اور عہدوں سے نوازا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کی نوجوان نسل ان واقعات سے بے خبر ہے ۔جب کہ اس دور کے انصاف پسند اور صاف ذہن ہندو برادران وطن اس بات کے معترف ہیں کہ انہیں مسلم دور حکومت میں کوئی اذیت نہیں دی گئی ۔ ہر معاملہ میں ان کے

ساتھ عدل وانصاف قائم رہا۔

تاریخ وشواہد کی روشنی میں درج حقائق پیش کئے جاتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہند نے ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری کے پیش نظر مندروں کی تعمیر واعانت کے سلسلہ میں جواقدامات کئے ہیں اس کو زمانہ فراموش نہیں کرسکتا بلکہ یہ بات ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ایک حکمران کو اپنی رعایا کے ساتھ اسی طرح کا عدل وانصاف، رواداری اور مذہبی آزادی کو روا رکھنا چاہیے جس طرح اورنگ زیب نے اپنے دور میں رکھا تھا۔

**سومیشورناتھ مہادیو:** الہ آباد میں اس مندر کی عظمت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس مندر کے مہنت کے انتقال کے بعد جو یہ مسئلہ عدالت میں پیش ہوا، تب اورنگ زیب نے بڑی وسیع النظری ورواداری کے پیش نظر ایک فرمان کے ذریعہ اس کا تیقن دیا کہ پوجاپاٹ کے لئے جاگیر عطا کی جارہی ہے تاکہ اس سے پوجاپورٹ کے اخراجات کے تکمیل ہوسکے ۔اس کے علاوہ دیگر منادر مہاکالیشور، اجین، چترا کوٹ اومانند گوہاٹی اور جین مندر کو بھی 1659ء سے لے کر 1689ء تک کی جاگیریں شہنشاہ اورنگ زیب نے عطا کی ہیں۔ اس سے اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ہندوؤں کے مسائل میں سنجیدہ ذہن رکھتے تھے۔اسی طرح ایک اور معاملہ میں ایک برہمن نے اورنگ زیب سے شکایت کی کہ کچھ لوگ نئے مندر کی تعمیر کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے اس کو پریشان کررہے ہیں ۔اس تعلق سے ایک فرمان جاری کیا گیا کہ اس میں کوئی مخالفت نہ کی جائے ۔ایک اور شکایت دھرج رام سنگھ نے کی کہ اس کے والد کی تعمیر کردہ گنگا کنارے مہادھورام میں رہائش پر قبضہ کیا جارہا ہے، تب اونگ زیب نے اپنے فرمان سے اس کو وہیں قیام کرنے اور پوجا کرنے کی اجازت دے دی ۔اسی طرح جنگمباری مٹھ والوں نے شکایت کی کہ نذیر بیگ نامی ایک شخص انہیں بے دخل کررہا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہدایت جاری کی کہ نذیر بیگ کے خلاف کارروائی کی جائے اور مٹھ میں رہنے والوں کو کشادہ اراضی عطا کی گئی۔

**رام جیون کو جاگیر:** اورنگ زیب عالمگیر نے برہمنوں اور فقیروں کی رہائش کے لئے مکانات بنائے جہاں پر وہ آزادی کے ساتھ پوجاپاٹ کرسکیں۔ یہ مقام بنارس میں گنگا کے کنارے بٹی گھاٹ پر واقع ہے جو جیون کوسین کے مکان کے روبرو اور مسجد کے پیچھے ہے، چونکہ یہ بیت المال کی ملکیت میں شامل ہے، لہذا بلا لحاظ مذہب وملت صرف ہندوؤں کے لئے اراضی عطا کی گئی جو اورنگ زیب کی ایک مثالی رواداری ہے۔

**گوہاٹی مندر:** اورنگ زیب نے گوہاٹی مندر کے پجاری کو ایک فرمان کے ذریعہ ایک خطّہ زمین عطا کی جس سے وہ جنگلوں کی آمدنی وغیرہ سے پوجاپاٹ واپنے رہن سہن کا انتظام کرسکے۔ ایسا اقدام بھی ہندوؤں کے ذریعہ بڑی قدر ومنزلت کا حامل بنا۔

**مہاکالیشور مندر اوجین:** اس کو ایک بڑا مندر تسلیم کیا جاتا ہے، یہاں پر روزانہ ایک دیپ جلایا جاتا ہے جس کے لئے ہر وقت چار سیر گھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ قدیم طرز عمل تھا جس کو اورنگ زیب نے بھی جاری رکھا جس کے ذریعہ کوتوالی کے تحصیلدار کو حکم دیا کہ روزانہ ۴ سیر گھی فراہم کیا جائے ۔اس حکم نامہ کی ایک نقل ترانوے سال بعد 1153ھ میں محمد سعداللہ نے جاری کیا۔اس

کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے کے کئی دستاویزات مندر کے مہانت لکشمی نارائن نے افسروں کو پیش کئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اورنگ زیب کس طرح کا عظیم روادار شہنشاہ تھا جس کے ہاں کوئی مذہبی دشمنی نہیں تھی۔

**شترنجایا اور ابومندر:** اپنے دورحکومت میں اورنگ زیب ایک جوہری کو مندر کے لئے ایک بڑی زمین عطا کی ۔صوبہ احمد آباد میں واقع زیرسورت سرکار کو بھی دو ایکر زمین بطور انعام عطا گیا۔اس طرح چنتامنی مندر کے معمار نگریش کو بھی گرنا اور ابو میں واقع مندروں کے لئے اراضی فراہم کی۔

**گرنا اور ابو جی:۔** جونا گڑھ میں واقع گرنال نامی میں شانتی داس جوہری کو ایک فرمان کے ذریعہ شہنشاہ اورنگ زیب نے پہاڑی اراضی کے احکام جاری کیے اور اس فرمان شاہی کے مطابق کسی بھی راجہ کو دخل اندازی کا اختیار نہ ہوگا' بعض مقامات پر اورنگ زیب نے مندروں میں غیر اخلاقی و مجرمانہ کاموں کو دیکھ کر اس کی مسدودی کا حکم دیا ایک واقعہ کے ذریعہ اس کا علم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کس قدر بلند و اعلیٰ رواداری کے حامل تھے۔

**وشوناتھ مندر کا انہدام:** ایک واقعہ یوں بھی ہوا کہ ایک مندر میں ایک رانی لاپتہ ہوگئی۔چنانچہ اطلاع ملنے پر اورنگ زیب نے تلاش کے احکام جاری کئے۔تلاش میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ مندر کی ایک دیوار میں نصب شدہ گنیش جی کا مجسمہ دراصل تھا ہی نہیں بلکہ اس جگہ نیچے سیڑھیاں تھیں۔وہاں جا کر دیکھا کہ وہاں رانی قید تھی اور وہ رو رہی تھی اور چلّا رہی تھی ۔جب اس ظالمانہ حرکت کا پتہ شہنشاہ کو چلا تو ایک فرمان کے ذریعہ سزا کا حکم دیا اور مندر کو بھی مسمار کرنے کا حکم دیا۔یہ اقدام مندر کی بے حرمتی کے لئے نہیں بلکہ انسانی گراوٹ کے پیش نظر کیا گیا ۔ڈاکٹر ستیارامیا نے اپنی کتاب ٹیچر اینڈ دی اسٹوڈنٹ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور پٹنہ میوزیم کے سابق کیوریٹر بی۔ایل۔گپتا نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔

**گولکنڈہ کی جامع مسجد:** جب اورنگ زیب کو اطلاع ملی کہ گورنر گولکنڈہ تاناشاہ نے محصول وصول کردہ کو مرکزی حکومت تک روانہ نہیں کیا اور اس رقم کو زمین میں دفن کر کے جامع مسجد تیار کی ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے متذکرہ مسجد چونکہ مسجد کی غرض سے تعمیر نہیں کی تھی' حکم دیا کہ اس کو مسمار کر دیا جائے اور محصول رقم تحویل میں لے کر دلی روانہ کیا جائے۔

بہرحال اورنگ زیب عالمگیر جیسے عظیم، نیک، انصاف پسند و روادار شہنشاہ کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ یہ ایک ولی صفت شہنشاہ تھے۔یہ وہ شہنشاہ ہیں جنہیں قرآن مجید اپنے ہاتھوں سے لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا' جو یقیناً ایک بڑی سعادت کی بات ہے ۔اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی کتاب ''تزک عالمگیری'' میں اپنے حالات و حکومتی نظم کے پیچ و خم کو بہت دلنشین انداز میں لکھا ہے جس کا مطالعہ دلوں کو مغموم کر دیتا ہے۔

**حرفِ آخر:** بڑے کرب سے اس حقیقت کے اظہار کیساتھ مضمون کو ختم کیا جاتا ہے کہ جہاں مسلمانوں نے آزادیٔ ہند میں اپنی قربانیاں دیں، ہندوستان کے چمن کو سنوارنے میں اپنا خون جگر دیا' فرقہ پرستی کچلنے اور رواداری کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا' ایسے حالت میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ''پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں''۔اس بات پر انسانیت آنسو بہانے لگتی ہے۔

☆☆☆

سید محبوب قادری نظامی
استاد جامعہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد؛ دکن

# حضرت انوار منفرد لب ولہجہ کے نعت گو شاعر

اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی اردو ادب کی نصرت اور فتح کی صدی مانی جاتی ہے۔ان دو صدیوں میں اردو نے ہندوستان کے چاروں جہات مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں اپنی کامیابی اور مقبولیت کے جھنڈے گارڑ دئے تھے۔ان دنوں فتح کی ڈور کچھ ایسے قابل اور دور اندیش مفکروں نے سنبھالی تھی کہ مقبولیت کی فتح چاروں جہات کے دروازوں کو کھٹکھٹا رہی تھی۔ان مفکروں کو دنیا سرسید احمد خان، مولانا شبلی، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکا اللہ کے نام سے جانتی ہے۔ان کو اُردو کے عناصر خمسہ بھی کہتے ہیں۔انہوں نے اردو کی ترقی کیلئے تصنیف و تالیف کے علاوہ نشر و اشاعت کے لئے بڑے مضبوط ادارے قائم کئے ۔ جیسے سرسید کی علی گڑھ تحریک، شبلی کا دارالمصنفین جن کے بارے میں پوری دنیا نے بہت پڑھا اور خوب لکھا، ان کے کاموں نے مقبولیت کی سند شہرت دوام حاصل کی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے فدایانِ اُردو ہیں جن کو دنیا جانتی ہے اور کچھ تو آج بھی گمنامی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں مولانا انوار اللہ خان فاروقی انورؔ نہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اردو ادب کی ترقی و ترویج میں شہرت دوام حاصل کی، نہ ان لوگوں میں ہیں جن کا مقدر گمنامی بنا بلکہ وہ ان لوگوں میں ہیں جن کو کچھ لوگ شیخ الاسلام، بانی جامعہ نظامیہ، استاد شاہاں، مصنف و مولف، مصلح، ادیب کی حیثیت سے اور بہت تھوڑے ہیں جو انہیں شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔انہوں نے اپنی مکمل حیات 70 سال عوام کی فلاح و بہبود اور اُردو ادب کی ترقی و ترویج میں صرف کر کے حیاتِ ابدی حاصل کی۔

حضرت انور نے اردو ادب کی ترقی کے لئے نہ صرف بیسیوں کتابیں تصنیف کیں بلکہ عوام کو اردو نوشت وخواند کے لئے 'جامعہ نظامیہ' کا قیام عمل میں لایا تاکہ عوام نوشت وخواندگی سے واقف ہوں تو تصنیف و تالیف کی اہمیت ہوتی ہے۔انہوں نے قیمتی اردو تصانیف کو بچانے عوام کو اردو نوشت وخواند سے جوڑ دیا اور پھر ان ہی عوام میں سے پیدا ہونے والے نئے قلمکاروں کیلئے ایک ادارہ نشر واشاعت کے لئے 'مجلس اشاعت العلوم'

کے نام سے قائم کیا جہاں سے سینکڑوں اردو ادب کی قیمتی تصانیف کو دیمک کی غذا بننے سے نہ صرف بچایا بلکہ آنے والے نئے قلمکاروں کی تصانیف کو منظر عام پر لانے کا پورا پورا انتظام کیا۔ آج بھی یہ ادارہ پوری محنت اور لگن کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ ان سب کے علاوہ حضرت انور کی شاعری بھی بڑی پر اثر اور معنی خیز ہے جسے بہت کم لوگوں نے پڑھا اور سمجھا ہے۔ اُردو ادب کی ترقی کے لئے انہوں نے شاعری کو بھی اپنایا اور بہت خوب شاعری کی۔ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ نعت گوئی پر محمول ہے۔ نعت کے لغوی معنی تعریف کے ہیں اصطلاح شعر و سخن میں ایسی تعریف جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ، سیرت طیبہ، معجزات کا بیان' اور ولادت با سعادت کا تذکرہ کیا گیا ہو' نعت کہلاتی ہے۔ نعت ایک موضوعی صنف کی حیثیت رکھتی ہے جس کے متعلق ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا وہ جواب ہے جس وقت ایک صحابی رسولؐ نے دریافت فرمایا تھا کہ اللہ کے رسول کی کچھ تعریف کیجئے۔ اس پر اُم المومنین نے ارشاد فرمایا تھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ہو؟ پورے کا پورا قرآن تعریف و مدحت احمد مختارؐ ہی تو ہے۔ عرب میں با قاعدہ طور پر شاعری میں اللہ کے رسول ﷺ کی تعریف کرنے والوں میں حضرت حسان اور حضرت کعب بن زہیر رضوان اللہ علیہا کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔

ان نفوس قدسیہ کے بعد ساتویں صدی ہجری کے ایک بلند پایا شاعر حضرت امام بوصیری علیہ الرّحمہ کا نام آتا ہے جن کی ولادت بتاریخ یکم شوال 608 ہجری مطابق 7 مارچ 1212 عیسوی کو بمقام بوصیر ہوئی۔ انہوں نے نعت گوئی میں بہت اونچا مقام حاصل کیا۔ ان کے عربی ادب میں بے شمار کارنامے ہیں لیکن قصیدہ بردہ یا پھر قصیدۃ المنام اُن کا کارنامہ حیات ہے۔ قصیدہ بردہ کے بے شمار تراجم ہوئے' میری دانست کے مطابق 25 سے زائد ہیں جن میں ابن الصنائع' شیخ علی بن محمد بن بسطامی' ملا علی قاری' جلال الدین المحلی اور قسطلانی جیسے محققین و محدثین نے بڑے ہی خوبصورت اور دلنشین انداز میں تشریح فرمائی ہے۔

نعت گوئی کے فن بارے میں بہت سارے دانشوروں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق کہا اور لکھا ہے۔ دیگر دانشوروں کی طرح میرا اپنا خیال ہے کہ نعت گوئی کا فن دیگر اصناف سخن سے بہت زیادہ کٹھن ہے' وہ اس لئے کہ نعت کے لفظی معنی تعریف کے ہیں اور تعریف میں اکثر زیادتی ہی ہوتی ہے' اگر کمی ہو جائے تو پھر وہ تعریف نہیں کہلائے گی اور زیادتی کی بھی اس صنف میں ایک حد ہے۔ اگر اس سے بڑھ جائے تو جس تعریف پر شاعر کی تعریف ہوتی تھی اور خدا اور اس کے رسول خوش ہوتے تھے اب اسی شاعری سے لوگ اس کو برا کہیں گے اور خدا اور رسول ناراض ہونگے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ نعت گوئی کا فن سیسہ گری سے بھی بہت زیادہ نازک ہے۔ سیسہ گری میں غلطی ہو تو جسم ہلاک ہو جاتا ہے اور اگر نعت گوئی میں غلطی ہو تو ایمان چلا جاتا ہے' ایک مسلمان کے پاس ایمان

سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہوسکتی ہے بھلا۔

نعت گو شاعر ایسے نازک اور کٹھن جگہ سے معانی ومفاہیم کے بیش بہا موتی لاتا ہے۔

نعت گوئی کا اصول اور اس کا قانون بتلاتے ہوئے امام بوصیری اپنے قصیدہ بردہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

دع ما ادعته النصاری فی نبیهم
واحکم بما شئتا مدحا فیه واحتکم

ooo

یہود اور نصاریٰ ان کے نبی کے بارے میں جو دعوی کیا تھا اس کو چھوڑ کر تم رسول اللہ ﷺ کی جتنی چاہے مدح کرو (یہود اور نصاریٰ اپنے نبی کی تعریف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور حضرت مریمؑ کو اللہ کی بیوی بنا دیا جو کہ اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف اور غلط ہے، جس کی دلیل سورۂ اخلاص ہے۔

مذکورہ بالا شعر میں امام بوصیری نے ہر نعت گو شاعر و ادیب اور عام انسان کو یہ بتلایا کہ تم رسول اللہ کی تعریف کرو اور خوب کرو لیکن اس تعریف میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھو کہ عبد و معبود، خالق اور مخلوق، اور ساجد اور مسجود کا فرق واضح رہے۔ جیسا کہ حضرت حسانؓ کا نظریہ اور عقیدہ ہے کہ ''خلقت مبراء من کل عیب'' یعنی اللہ کے رسولؐ مخلوق خدا میں بے عیب و یکتا پیدا کئے گئے ہیں یا پھر حضرت شیخ سعدی کے نظریہ اور عقیدہ کی طرح ہو جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' یعنی اللہ کے بعد کوئی قابل تعریف ہے تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مذکورہ دلائل وقواعد سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کائنات میں کوئی ذات اور شئے ایسی نہیں ہے جو اس خدائے ازل و ابد کی ہمسری و برابری کا دعوی کر سکے۔ ہرگز نہیں، قطعاً نہیں۔ نہیں نہیں بس نہیں۔ اس بال سے باریک فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ہر زبان میں نعت گوئی کے فکر و فن، الفاظ ومعانی، خیال و ندرت کے بے شمار فن پارے تخلیق کئے گئے جن کے پڑھنے سے زبان کو حلاوت، نظر کو روشنی، ذہن کو تازگی، روح کو غذا، دل کو سکون اور ایمان کو جلا ملے۔

ایسے فن کار اردو زبان و ادب میں بھی پیدا ہوئے جن میں امیر خسرو، خواجہ میر درد، سراج اورنگ آبادی، علامہ اقبال، اعلیٰ حضرت، امیر مینائی، علامہ شائق، امجد حیدرآبادی، صفی اورنگ آبادی اور انور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر شاعر کا مکمل نام حافظ محمد انوار اللہ فاروقی انور ہے۔ فضیلت جنگ، خان بہادر، شیخ الاسلام وغیرہ خطابات ہیں۔

حضرت انوار کی شاعری کے جمالیات کو عصر حاضر کے بڑے بڑے نامور قدآور اردو زبان و ادب کے ناقدین نے سراہا ہے اور اپنی پسندیدگی کی مہریں ثبت کی ہیں۔ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی حضرت انوار کی شاعری کے بارے میں کچھ یوں لکھتے ہیں کہ:

''علامہ انوار اللہ انور کے کلام میں کلاسیکی پختگی اور مشاقی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ زبان نہایت ٹکسالی اور

با محاورہ ہے''۔(دیوان انوار' شاہ محمد فصیح الدین نظامی' شیخ الاسلام لائبریری اینڈ ریسرچ فاونڈیشن' ص 14)

حضرت انوار کا ایک شعری مجموعہ ''شمیم الانوار ''اور انوار احمدی'' کے مسدسات اور اور ایک غیر مطبوعہ '' کلام انوار'' وغیرہ ہے۔حضرت انوار نے اپنے کلام میں انوآر اور انور دونوں تخلص استعمال کئے ہیں' ان کی نعت گوئی میں محبتِ رسول' جذبۂ ایمانی' اہلِ بیت سے محبت' رسول اللہ ﷺ کے معجزات پاک' اسلامی تعلیمات کا تذکرہ' رسول اللہ ﷺ کے اخلاق حسنہ' ولادت باسعادت کے پرنور واقعات وغیرہ کی ایک کہکشاں ہے جس کے معانی ومفاہیم کی چمک ہر قاری و سامع کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔ اُن کے ہنرمندانہ الفاظ قارئین سے بڑی معصومیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ پہلے مجھے دیکھو اور صنائع و بدائع کہتے ہیں کہ میاں کچھ دیر رکو اتنی جلدی بھی کیا ہے' ہم تم کو صنعتوں کی دنیا کی سیر کرالاتے ہیں'' ہوں زمیں پر گزر فلک پر مرا'' کی منزل کا مکیں بنا دیتے ہیں' کی گزارش موجود ہے۔

ذیل میں حضرت انوار کے چند نعتیہ اشعار دئے جاتے ہیں:

ذکر ختم المرسلیں اس نظم سے مقصود ہے
جو ازل سے تا ابد ممدوح اور محمود ہے
رفع ذکر پاک ثابت ہے کلام اللہ سے
مطمئن ہوتے ہیں دل ذکر شہ لولاک سے
ابوالبشر نے کی وصیت وقت آخر شیث کو
کہ قرین ذکر حق ذکر محمد کی جیو
کیسی طاعت ہوگی وہ جس میں ہو خود حق بھی شریک
ہے جو طاعت سے بری جس کا نہیں کوئی شریک
بے صلواۃ احمدی کامل نہ ہو ہرگز صلواۃ
التحیات اس کی ہوجاتی ہے بالکل واہیات

ooo

سب جانتے ہیں کہ حضرت انوار عربی زبان و ادب کے بڑے عالم' محدث مفسر اور ادیب ہیں۔انہوں نے عربی زبان وادب کے محاورے اور الفاظ کو اردو میں اس خوبصورت انداز سے برتا کہ عربی ادب کی خاصیت اردو میں منتقل ہوگئی۔ یہ حضرت انوار کی جدت پسندی اور ان کا اپنا ایک نیا انداز ہے جس کے وہ خود راہ نما اور راہ رو منزل رہے۔ان ہی صلاحیتوں کی بنا انوار اپنے ہم عصر کبار شعراء کی صف میں جگہ بنا لیتے ہیں۔حضرت انوار کی موجودگی ان کے ہم عصر شعراء و ادِبا کے لئے ایک نعمت ہے۔اور کیوں نہ ہو؟ جنہیں اللہ نے فکر وفن' علم وحکمت' بصارت وبصیرت' اور عزت وشرف سے مالا مال کیا ہو۔ذیل میں عربی محاورے کے چند اشعار دئے جاتے ہیں جس سے قاری پر حضرت انوار کی نکتہ دانی واضح ہوجاتی ہے:

اگر ارشاد بی یبصر ہوا
وگر بی یبطش و بمشی کہا ہے
تھی غرض تعلیم گو کرتے تھے شوری ظاہرا
حق نے لما یعلم اللہ گر کہا تو کیا ہوا
ہو کے شاداں انت حرہ اِذھبی اس کو کہا

ساتھ اس کے اس کا ہاتھ بھی کچھ ہل گیا
کشت عالم سبز ہے باد بہاری آتی ہے
صاحب انا فتحنا کی سواری آتی ہے
کہ وہ ختم الانبیاء اور خیر خلق اللہ ہیں
ہیں وہ شمس الانبیاء گر انبیاء سب ماہ ہیں
ہر مسلماں چھوڑے کیونکر نعت کو بالکیہ
لیس تیرک کل مالا یدرک بالکیہ

ooo

مسدس کو اُردو زبان کے نامور شاعر میر انیسؔ نے مرثیہ کیلئے استعمال کیا ہے تو الطاف حسین حالیؔ نے اسلام کی عزت وقار کیلئے استعمال کیا ہے ۔ تو وہیں پر حضرت انوار نے مسدس کو نعت گوئی کے لئے بڑی عمدگی اور شائستگی، سہل ترین الفاظ کی بندش، معانی ومفاہیم کی گہرائی و گیرائی، حسن ادا کے ساتھ معانی کا بھر پور خیال رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے:

پس وہ نور پاک رب العالمین پیدا ہوئے
مبدائے کونین و ختم المرسلین پیدا ہوئے
جان عالم قبلۂ اہل یقین پیدا ہوئے
شکر ایزد رحمۃ للعالمین پیدا ہوئے

ooo

دھوم تھی عالم میں خورشید کرم طالع ہوا
ہاں کریں تعظیم اب نور قدم طالع ہوا
ٹھہرا کفارہ گناہوں کا جو ذکر اولیا
اور از قسم عبادت ہو جو ذکر انبیاء
پھر ہو ذکر سرور عالم کا کیا مرتبا
جن کا ذکر پاک ہے گویا کہ ذکر کبریا
رفع ذکر پاک ثابت ہے کلام اللہ سے
مطمئن ہوتے ہیں دل ذکر شہ لولاہ سے
جب ولادت کا زمانا باسعادت آگیا
پہنچیں خدمت کیلئے جلدی سے مریم آسیا
باندھیں حوروں نے پرے جس سے تھا سارا گھر بھرا ہوا
اور ملائک آفتابے لے کھڑے تھے جا بجا
شب برات و قدر ہو جس پر فدا کیا رات تھی
تھا نمایاں جلوہ شان خدا کیا رات تھی

ooo

آخر میں اپنی بات ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں کہ وہ کہتے ہیں:

''حضرت انور کے شعری سرمائے میں معرفت اور درس عبرت حاصل کرنے کے مناظر موجود ہیں۔ وہ مظاہر فطرت جو آیات الٰہیہ کہلاتے ہیں جن کے ذریعہ خدا کی جلوہ سامانی ہوتی ہے جو عاشق کے دل کے لئے سکون کا باعث ہوتے ہیں اور عرفان الٰہی کے لئے منازل طے کرنے میں مدد بھی دیتے ہیں۔ یہ وہ اسرار الٰہی ہیں جن کی معرفت کے ذریعہ خدا کی صفات تک رسائی ہوتی ہے اور یہ وہ مجاز ہیں جن کے ذریعہ حقیقت تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے۔''

(دیوان انوار، مرتب شاہ محمد فصیح الدین نظامی، ص16)

☆☆☆

ایس.ٹی.نوراللہ
ریسرچ اسکالر
شعبۂ عربی، فارسی واُردو
مدراس یونیورسٹی، چنئی

# راجا نرسنگھ راج عالؔی بحیثیتِ رباعی گو شاعر

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے۔رباعی کے معنی چار کے ہیں۔اصطلاحِ شعر میں رباعی ان چار مصروں کو کہتے ہیں جو اوزانِ رباعی (شجرۂ اخرب واخرم) میں کسی وزن پر ہو۔اصنافِ سخن میں یہ سب سے قدیم اور مختصر ترین صنف ہے۔نظم میں یہ ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔اس میں اختصار کے ساتھ جامعیت کی جوصفت پائی جاتی ہے وہ دیگر اصنافِ شعر میں مفقود ہے۔رباعی کے ایجاد کا سہرا ایرانی شعراء کے سر جاتا ہے۔اس کا نام اگر چہ عربی ہے۔عربی میں رباعی ''دوبیت'' کے نام سے موسوم ہے۔رباعی سے ملتی جلتی چیزیں دیگر زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً سنسکرت میں ''چار چرن'' ہندی میں ''چوپائی'' وغیرہ۔اردوادب میں رباعی فارسی کے زیرِ اثر وجود میں آئی۔

شہرِ محبت (حیدرآباد)،صدیوں سے ایک علمی وادبی دبستان رہا ہے۔اس شہر میں ادیب ومحقق،شاعر و ناقد اپنے فن پاروں کی وجہہ سے پوری اردو دنیا میں مشہور ومعروف ہیں۔اسی شہر کے ایک بلند مرتبہ،بلند قدر و قیمت رکھنے والے نامور شاعر راجا نرسنگھ راج عالؔی تھے۔آپ حیدرآباد کی مشہور و معروف شخصیت راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقؔی کے مایۂ ناز فرزند تھے اور آپ کی ولادت ۱۸۸۹ء کو ہوئی اور ۲۳ جون ۱۹۵۷ء کو انتقال کر گئے۔

عالؔی ابتداء میں ہندی، مراٹھی اور فارسی زبان کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔بعد ازاں آپ مدرسۂ عالیہ میں بھرتی ہوئے اور وہاں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ موصوف نے شاعری میں فصاحت جنگ جلیل جیسے جلیل القدر شاعر کے تلمذ میں رہے۔گلستانِ شعر وسخن میں آپ نے اپنے کلام میں فصاحت و بلاغت کے جو پھول مہکائے ہیں، رنگینی اور لطافت بکھیری ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فطری شاعر ہیں۔آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آمائی کی۔جیسے غزل،نظم، رباعی قصیدہ، مرثیہ اور قطعہ وغیرہ۔

عالؔی کی رباعیوں میں مختلف موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔جیسے پند و نصاح،قدرت کی بڑھائی، ہمت افزائی، ہمدردی و عاجزی،خوش مزاجی وملنساری وغیرہ۔آپ نے اپنی شاعری کے ذریعہ سماج میں پھیلنے والی برائیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔جوئے سے تباہی اور شراب نوشی کے مضر اثرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔وہ جواریوں کے بارے میں یوں

رقمطراز ہیں:

جوئے میں ہے قتل اور لڑنا زیادہ
سنبھلنا ہے کم اور اجڑنا ہے زیادہ
کہیں اور کیا مختصر ہے یہ عالؔی
کہ بننا ہے کم اور بگڑنا زیادہ

ooo

آپ نے اپنی رباعیوں سے حب الوطنی، بھائی چارگی، یک جہتی اور امن و امان سے زندگی گزارنے کی صلاح بھی دی ہے۔آپ کی نظروں میں ہندومسلم بھائی بھائی تھے اور دونوں کے آپس میں گہرے ناطے تھے۔دو رباعیات ملاحظہ ہو:

حق والو بتاؤ دیر و حرم کہاں
جب ایک وطن میں ہو تو پھر بیر کہاں
خالق دونوں کا جب نہیں دو عالؔی
ہندومسلم ہیں ایک غیر کہاں

ooo

دل دُکھانے میں کیا بھلائی ہے
جب ہر انسان اپنا بھائی ہے
رو رہا ہوں میں سن کے یہ عالؔی
ہندو مسلم میں اب جدائی ہے

ooo

آپ کے ہاں مذہب کی قدر دانی ملتی ہے اور آپ کے یہاں دل ہی خدا کا گھر ہے اور کوئی دوسری جگہ کی اہمیت نہیں ہے۔اسی لیے تو کہتے ہیں۔

آستان پر تیرے جس دن سے جھکا سر اپنا
یا دمسجد ہے نہ ہے دھیان میں مندر اپنا
دل کو تم صاف کرو ہے یہی اللہ کا گھر
یہی معبد یہی مسجد یہی مندر اپنا

ooo

عالؔی نے اپنی رباعیوں میں اپنے آباء واجداد اور اپنے اساتذۂ کرام کی اس دارِفانی سے رخصتی کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

کون ہے وہ آج جو نالاں نہیں
دل ہیں مرجھائے ہوئے خنداں نہیں
کیا کہیں ہم اپنا عالؔی حال دل
شاؔد بھی باقی نہیں شاداؔں بھی

ooo

مٹا شعر وسخن کا خوش نما فلم
نہیں استاد سا اب صاحب حلم
کہی برجستہ عالؔی نے یہ تاریخ
فطاحت جنگ تھے اک قبلہ علم

ooo

بے کینہ ہی انسان کا سینہ اچھا
جو خلق کے کام آئے دفینہ اچھا
عالؔی کمسن تھا تو نے کھویا والد
سمجھا تھا کہ بس ماں کا ہی جینا اچھا

ooo

عالؔی کی شاعری انسانی جذبات و خیالات سے

لبریز ہے۔اس لیے عالؔی کے یہاں سچائی، حب الوطنی، خلوص،تعاون،مذہبی عقائد سے لگاؤ، معاشرتی اور جمالیاتی جذبات، ہمدردی،خوشی اور مسرت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔جبکہ ان کے یہاں غم،نفرت،حسد کا اظہار نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتا ہے۔ ہر انسان کی طرح ان میں بھی یہ جذبات موجود ہیں مگر انہوں نے ان جذبات کو بھی مثبت روپ عطا کر کے خوبصورت انداز میں پیش کر کے اپنی فطرت کا اظہار کیا ہے۔

نہیں ہے راہ صداقت میں کوئی خوف وخطر
ہزاروں جھوٹ ہیں ایک جھوٹ نبھانے میں

ooo

عالؔی کی شاعری کا ایک رخ تصوف بھی ہے۔ عالؔی ہمیشہ صوفیانہ کلام کے شائق رہے۔عام طور پر غزل گو شعراء نے تصوف کے مسائل کو بھی غزلیہ شاعری میں پیش کیا ہے۔اسی طرح عالؔی نے بھی کیا جن میں عبرت کی گہری نظر بھی ملتی ہے اور عبارت کی روانی بھی ملتی ہے۔دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

کس منہ سے کروں حمد الٰہی تیری
دیتا ہے ہر ایک ذرّہ گواہی تیری
بے مانگے دیا کرتا ہے تو بندوں کو
رحمت ہے محبوب لا متناہی تیری

ooo

گر مجھ پہ نگاہ مہربانی ہوجائے
کچھ کام کی میری زندگانی ہوجائے
دے میرے گناہوں کا صلہ یہ یارب
ہوجائے نجات میری جاودانی ہوجائے

ooo

آپ اس دنیا کی ہر چیز کے فنا ہونے پر یقین رکھتے ہوئے عدم میں یقین رکھتے ہیں اور عدم کے جانے والے مسافروں سے یہی صدا دیتے ہوئے کہتے ہیں:

عدم کے جانے والو دیر سے پہنچیں تو یہ سمجھو
تھکے ماندے مسافر سانس دم بھر لے کے آتے ہیں

ooo

عالؔی اپنے زمانے کے ایک قابلِ قدر شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک خوش اخلاق انسان بھی تھے، یہی وصف ان کی رباعیوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔عالؔی نے اپنے مخصوص موضوعات،تشبیہات و استعارات، بے پناہ لفظیات، جذبات و احساسات،فکر و مشاہدات اور ان کا اپنا اندازِ بیاں،طرزِ کلام،منظر نگاری، پیکر تراشی اور منفرد لب ولہجہ سے رباعی کو پروان چڑھایا۔اوران کی رباعیوں کو اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

☆☆☆

## درسِ حیات

☆ جاہل،احمق اور بدکردار سے اچھے مشورے کی توقع ہرگز نہ رکھو!
☆ اگر عورت بھی صاحبِ کردار ہے تو اس سے مشورہ لو۔
☆ بے وقوف کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے،لیکن تنہائی سے بہتر ہے کہ اچھے لوگوں کی تلاش جاری رکھو!یقیناً تم اُن تک پہنچ جاؤ گے۔

حکایاتِ رومیؒ (مثنوی روم)

شفیق اطہر جرنلسٹ
حیدرآباد

# مولانا محمد علی جوہر: بے باک صحافی، عظیم مجاہد آزادی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر 1878ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ماں کو نبھانی پڑی۔ موجودہ روایت کے مطابق اُردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد بریلی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا، جہاں سے بی اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ بڑے بھائی شوکت علی کی خواہش تھی کہ آپ آئی سی ایس کا امتحان پاس کریں، جس کے لیے انہیں آکسفورڈ یونیورسٹی بھیجا گیا، لیکن یہاں ناکامی ہاتھ لگی۔ لندن سے واپس آنے کے بعد محمد علی چاہتے تھے کہ علی گڑھ میں استاد کی حیثیت سے قوم کی خدمت کریں، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ مجبوراً ریاست رام پور میں اعلیٰ تعلیمی افسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ دنوں تک ریاست بڑودہ میں بھی کام کیا۔ لیکن مولانا کو خدا نے کسی اور کام کے لیے پیدا کیا تھا۔ شروع سے ہی مولانا کی یہ خواہش تھی کہ صحافت کو وہ اپنا میدان بنائیں اور اس کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت انجام دیں۔ لہٰذا، 11-1910ء سے کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار 'کامریڈ' نکالنا شروع کیا۔ 1912ء میں جب انگریزوں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنالیا، تو محمد علی بھی دہلی آگئے اور یہاں سے 1914ء سے اُردو روزنامہ 'ہمدرد' نکالنا شروع کیا۔ یہ دونوں اپنے وقت کے مشہور اخبارات تھے، جن کی مثال آج بھی کم ہی ملتی ہے۔

بحیثیت صحافی مولانا نے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے دو اخبارات نکالے۔ 150 'کامریڈ' اور 'ہمدرد'۔ 'کامریڈ' انگریزی کا اخبار تھا جب کہ 'ہمدرد' اردو کا۔ 'کامریڈ' ایک ایسا انگریزی اخبار تھا، جس کا لوہا انگریز بھی مانتے تھے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انگریز 'کامریڈ' کی کاپی اپنے دوستوں کے لیے تحفے کے طور پر لندن بھی لے جایا کرتے تھے۔ اس اخبار کو نکالنے کا مقصد دراصل انگریزوں کو ہندوستانی عوام کے مسائل سے آگاہ کرنا تھا۔ دوسرا اخبار 'ہمدرد' تھا جسے مولانا محمد علی جوہر نے ہندوستانی عوام اور خاص کر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نکالنا شروع کیا تھا۔ اس اخبار میں جہاں ایک طرف اسلامی ممالک کی خبریں ہوا کرتی تھیں، وہیں دوسری طرف ملکی اور غیر ملکی خبریں بھی

شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں شعروسخن، طنز و مزاح، تہذیب وثقافت کے بھی گوشے ہوا کرتے تھے۔

مولانا اعلیٰ صحافتی اصولوں کے پابند تھے۔ ان اصولوں کو زندہ رکھنے کے لیے وہ بڑے سے بڑا مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ مولانا کا یہ اصول تھا کہ کوئی بھی خبر بغیر تصدیق کے نہ چھاپی جائے۔ خبر چاہے دوست کی ہو یا دشمن کی، اسے غیر جانبداری کے ساتھ شائع کیا جائے۔ مولانا اخبار میں اشتہار چھاپنے کے سخت مخالف تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ایسا کرکے بہت سارا پیسہ کما سکتے تھے، لیکن انہوں نے مالی نفع کے بجائے اعلیٰ صحافتی اصولوں کو ترجیح دی۔ مولانا روزانہ شام کو تمام اسٹاف کے ساتھ میٹنگ کرتے اور اخبار سے متعلق اہم موضوعات پر ان کے ساتھ گفتگو کرتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے خبریں حاصل کرنے کے لیے رائٹر اور ایسوسی ایٹیڈ پریس کی خدمات بھی حاصل کیں اور لیتھو کے بجائے ٹائپ کی چھپائی کو فروغ دینا چاہا، لیکن افسوس کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نے ادب، سیاست یا صحافت میں جو کچھ بھی اثاثہ چھوڑا، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے بغیر ہندوستانی تاریخ تکمیل کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ مولانا محمد علی جوہر اُن عظیم مجاہدین آزادی میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے نہ صرف زندگی کا ایک لمبا عرصہ جیل میں گزارا، بلکہ لندن جاکر گول میز کانفرنس کے دوران انگریزوں سے یہ تک کہنے کی ہمت کی کہ 'میں غلام ملک میں مرنا نہیں چاہتا، یا تو میرے ملک کو آزاد کردو یا پھر اپنے ملک میں دفن ہونے کے لیے دوگز زمین دے دو'۔

مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی زندگی پر اگر ہم نظر دوڑائیں تو ہندوستانی تاریخ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'خلافت تحریک' ہے۔ یہ وہ تحریک تھی، جو ترکی کے مسلمانوں کی حمایت میں شروع کی گئی تھی، لیکن بعد میں اس نے ہندوستانی جنگ آزادی کی شکل اختیار کرلی۔ یہی وہ پلیٹ فارم تھا، جہاں سے مہاتما گاندھی نے اپنی ہندوستانی سیاست کا آغاز کیا۔ عدم تعاون اور خلافت تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرکے انگریزوں کے خلاف لا کھڑا کیا۔ دونوں قوموں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ انگریز مخالف اقدامات اٹھانے شروع کیے، تاکہ ہندوستان کو ان کی غلامی سے آزاد کرایا جاسکے۔ اس کے لیے محمد علی جوہر نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مرتے دم تک انگریزوں سے اس بات کے لیے لڑتے رہے کہ یا تو ملک کو آزاد کردو یا پھر مرنے کے بعد دوگز زمین اپنے ملک میں دے دو۔ وہ کسی غلام ملک میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اپنا قول پورا کرکے دکھا دیا۔ لندن میں موت ہوئی اور تدفین بیت المقدس میں۔

سیاسی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ بھی آئے، جب انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن

جائیں۔لیکن بدقسمتی سے انہیں ایسے دن بھی دیکھنے پڑے۔ اپنی طرف سے انہوں نے پوری کوشش کی کہ یہ دونوں قومیں دوبارہ متحد ہو جائیں اور بجائے اپنی طاقت کو ایک دوسرے کے خلاف ضائع کرنے کے اسے انگریزوں کے خلاف لگائیں۔'ہمدرد' کی فائلیں شاہد ہیں کہ قومی یکجہتی کے لیے مولانا نے کتنی کوششیں کیں۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی مسلمانوں کو ہمیشہ یہ سمجھاتے رہے کہ اگر گائے کی قربانی دینے سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو تو وہ اس سے گریز کریں اور گائے کے بجائے کسی دوسرے جانور کی قربانی دیں۔ اسی طرح وہ ہندوؤں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ محرم کا مہینہ چونکہ مسلمانوں کے لیے ماتم وغم کا مہینہ ہوتا ہے، اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کم ازکم ان مقامات پر خوشی کا اعلانیہ اظہار کرنے سے پرہیز کریں، جہاں پر مسلمانوں کا عام طور پر آنا جانا ہوتا ہے۔محمد علی جوہر چاہتے تھے کہ دوسرے قومی رہنما بھی ان کے اس مشن میں اسی طرح کوشش کریں جیسا کہ وہ کر رہے ہیں، لیکن دوسروں سے انہیں مایوسی ہوئی۔ آخرکار وہ اس قدر مایوس ہوئے کہ کانگریس سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کانگریس ایک ایسی سیاسی پارٹی تھی جس پر مولانا کو بڑا اعتماد تھا، لیکن بعد میں کچھ ایسے حضرات اس میں شامل ہوگئے جن کے کارنامے شک کے دائرے میں آتے تھے۔ اس طرح مولانا کا اعتماد اس پارٹی سے اٹھ گیا۔

مولانا محمد علی جوہر کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مولانا کی طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر بن سکتے تھے، لیکن شاعری میں جس مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ان کے اندر نہیں تھی۔ اسی طرح وہ ایک بہترین ماہر تعلیم بن سکتے تھے، لیکن یہاں بھی ان کے قدم زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے۔ ایک عظیم سیاست داں بن سکتے تھے، لیکن کچھ دنوں کے بعد اس میدان کو بھی انھوں نے خیر باد کہہ دیا۔ اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی جب انھوں نے قدم رکھا تو بڑی کامیابی ہاتھ لگی، لیکن بعد میں کئی چیزوں میں ایک ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے اپنے اخبار کو بھی کم وقت دے پاتے تھے۔ گویا، ان کی پوری زندگی اسی بے قراری کی نذر ہوگئی۔ ان تمام چیزوں کے باوجود جو کچھ اثاثہ انھوں نے اردو ادب یا صحافت میں چھوڑا، وہ ہمارے لیے بیش قیمت ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری پر اگر نظر ڈالیں، تو ہمیں کچھ ایسے اشعار ضرور مل جاتے ہیں جن کو ہم بہترین اشعار کا درجہ دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہ دو اشعار جو آج بھی زبان زد خلائق خاص وعام ہیں:

تو حید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

ooo

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ooo

مولانا کی یہ شاعری صرف ان ہی دنوں کا نتیجہ ہے، جب وہ جیل میں تھے۔فرصت کے اوقات میں جب کہ ان پر ہر طرح کی پابندی عائد تھی، لیکن ذہن و دماغ پر بھلا کون پابندی عائد کر سکتا ہے۔ لہٰذا، شاعری کا یہ مختصر ذخیرہ آج ہمارے سامنے ہے۔جیل سے باہر آنے کے بعد سیاسی ہنگامہ آرائی اور صحافت کی ذمہ داریوں نے انہیں کبھی اس کی مہلت فراہم نہیں کی کہ وہ دو گھڑی فکر شعر وسخن کر لیا کریں۔اس کے علاوہ، ادبی سرمایہ کے طور پر مولانا کے چند خطوط بھی منظر عام پر آ چکے ہیں جو انہوں نے اپنے دوست واحباب کو لکھے۔ان میں ہمیں ادبی چاشنی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ یہ خطوط ان کی ذاتی زندگی کے عکاس ہیں۔

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ انگریزوں کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ انہوں نے ہندوستانی حکومت چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی، لہٰذا 1857ء کی بغاوت کے پوری طرح ذمہ دار یہاں کے مسلمان ہیں۔ اور اسی شک کی بنیاد پر انہوں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔مسلمان جو کہ پہلے سے ہی تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے دیگر قوموں سے پچھڑے ہوئے تھے، انگریزوں کے اس عتاب کی وجہ سے ان کو مزید رسوائی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید نے جو مسلمانوں کی اس زبوں حالی سے کافی غم زدہ تھے، اپنی حکمت عملی سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے انگریزوں کو یہ بھروسہ دلایا کہ ہندوستانی مسلمان ان کے دشمن نہیں، بلکہ دوست ہیں اور 1857ء کی بغاوت کا سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی نہیں بلکہ خود انگریزوں کی بعض غلط پالیسیاں ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے اور تعلیم کی طرف توجہ دینے کی تلقین کی۔اسی سلسلے میں انہوں نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس کی حمایت نہ کریں اور اس سے دوری برقرار رکھیں۔ لہٰذا، اس زمانے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس مخالف ہو گیا تھا۔ یہ علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) ہی تھے جن کی کوششوں سے مسلمان دوبارہ کانگریس میں داخل ہوئے۔

باوجود اس کے جب ملک آزاد ہوا، کانگریس کی حکومتوں نے صرف اس لیے مولانا محمد علی جوہر کو نظر انداز کیا اور حاشیہ پر ڈال دیا، کیوں کہ اس عظیم مجاہد آزادی نے اس پارٹی کی خرابیوں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ یہ سراسر ناانصافی اور بد دیانتی ہے۔ جہد و جہد آزادی میں ان کا جو مقام ہے، اس کا موازنہ اگر اس وقت کے یا بعد کے لیڈروں سے کیا جائے، تو ان کے سامنے شاید دوسرے لیڈر بونے پڑ جائیں۔مولانا کی یومِ پیدائش کے موقع پر کانگریس سمیت ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کو چاہیے کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کی قربانیوں کو یاد کریں اور آج کی نسل کو ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتائیں، تاکہ آنے والی نسلیں بھی انہیں یاد رکھ سکیں۔

**جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی:**

سال 1920ء کے آخر اور 1921ء کے شروع کے زمانہ میں ہندوستان میں ترک موالات کے نام سے ایک زبردست تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں تقریباً پورے ہندوستان نے حصہ لیا اور تمام انگریزی چیزوں کا بائیکاٹ کیا جانے لگا۔ مثال کے طور پر غیر ملکی کپڑے، انگریزوں کی سرپرستی میں چل رہے اسکول اور کالج اور اس طرح کی دیگر اشیاء۔ اس تحریک کے روحِ رواں علی برادران اور مہاتما گاندھی تھے۔ تحریک کا اعلان کانگریس کے کلکتہ میں ستمبر 1920ء میں منعقدہ اجلاس میں کیا گیا۔ تحریک کا آغاز محمد علی جوہر نے سب سے پہلے علی گڑھ جا کر کیا۔ انہوں نے کالج کے طلبہ کو یہ تلقین کرنا شروع کر دیا کہ ایسی حکومت سے جو خلافت اسلامیہ سے برسرپیکار ہو، اسلام کی دشمن ہو، اس سے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔ لہٰذا، اس وقت ہر ہندوستانی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ حکومت سے ملے ہوئے ہر عہدے اور منصب کو اسے واپس لوٹا دے۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم سے بے بہرہ کر دیا جائے، بلکہ زور اس بات پر دیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اپنا نصاب خود تیار کریں، اپنے استاد خود منتخب کریں۔ گویا، پوری طرح ایک ہندوستانی نظامِ تعلیم کی بنیاد ڈالیں۔ پہنچ تو گئے علی گڑھ، لیکن وہاں پہ زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ پولس بھی آئی اور ان کے ساتھیوں پر ڈنڈے بھی چلائے گئے لیکن، وہ بھلا کب ہار ماننے والے تھے۔ اپنے رفیقوں کے ساتھ درخت کی چھاؤں میں کلاس لینا شروع کر دیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مقدس ہاتھوں سے 1920ء میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ محمد علی جوہر خود ہی پرنسپل کے فرائض انجام دیتے، اساتذہ کا انتخاب بھی کرتے اور بی اے تک کا نصاب بھی ہر مضمون کا خود ہی تیار کرتے۔ اس کے بارے میں اپنے اخبار 'ہمدرد' کے 30 اکتوبر، 1920ء کے شمارہ میں جامعہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''اس کا (جامعہ کا) پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔''

پہلے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں، '' جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو 'جامعہ' اور 'ملیہ' ہے، یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور نہ وہ تو دیوبند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے' پھر یہ جامعہ، جامعہ اسلامیہ ہے، یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے۔ گو دیگر مذاہب کے پیروؤں کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں ہے، وہ اسلام کو صحیح تفسیرِ حیات سمجھتی ہے، اور اسلامی اصولوں کی اس لیے تعلیم دیتی ہے کہ وہ اسرار زندگی سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی لیے نصاب جامعہ میں سب سے خاص بات جو رکھی گئی ہے وہ یہ کہ عربی

لازمی ہو اور نثر کا تمام تر کورس قرآن کریم ہوتا کہ طالب علم اس قدر عربی سیکھ لے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کو کم از کم اس طرح سمجھ سکے جس طرح ایک اُمی عرب رسول کریم کے زمانہ میں سمجھ سکتا تھا، تاکہ اسے اپنی مذہبی ضروریات کے لیے کسی دوسرے کا دستگیر نہ ہونا پڑے۔ پھر دوسری طرف مسلمان کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفاتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو۔ ادب اور تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے ذریعے سے وہ سارے عالم کو اپنی جولانگاہ بنا سکیں۔''

اس کے بعد دوسرے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں،'' یہ تعلیم کا وہ خاکہ تھا جو ایک جامعہ اور جامعہ اسلامیہ کے شایان شان تھا۔ لیکن ابھی لفظ نیشنل کا ذکر نہیں آیا ہے، حالانکہ یاد رکھنا چاہیے کہ جامعہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہونے کا بھی دعویٰ کرتی ہے۔ ہم ہندوستان کے مسلمان، مسلمان ضرور ہیں مگر ہندوستانی بھی ہیں۔ اس میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں ہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آباد ہیں اور ان کے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں اور ان کی کثرت ہے۔ جامعہ کے بانیوں پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس ملک کی آزادی کے لیے (اور ایک مسلمان کے لیے آزاد ہونا لازمی ہے۔ اس لیے کہ وہ سوائے خدا کے کسی کا عبد و غلام نہیں ہو سکتا) مسلمانانِ ہندوستان کا اپنے ہمسایہ بھائیوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط قائم کرنا اور قائم رکھنا لازمی و لابدی ہے، اس لیے ایک طرف تو جامعہ نے اپنا دروازہ ہر اس ہندوستانی کے لیے کھول دیا جس کو جامعہ کی فضا میں رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تعصب نہ ہو۔ دوسرے جامعہ کے ہر طالب علم دل میں خواہ ہندو ہو یا مسلمان ملک کی محبت اور اغیار و اجانب کی غلامی سے نفرت پیدا کرنا جامعہ نے پہلے ہی دن سے اپنا وظیفہ سمجھا اور جامعہ کی فضا کو غلو اور تعصب سے پاک صاف رکھا۔ اس لیے حقیقی معنوں میں جامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نیشنل یونیورسٹی ہے۔''

☆☆☆

## سنہرے الفاظ

مصر کے مشہور عالم اور ادیب شیخ علی طنطاوی نے بڑی قیمتی باتیں بتائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

☆ جو لوگ ہمیں نہیں جانتے' ان کی نظر میں ہم عام ہیں۔

☆ جو ہم سے حسد رکھتے ہیں' اُن کی نظر میں ہم مغرور ہیں۔

☆ جو ہمیں سمجھتے ہیں' اُن کی نظر میں ہم اچھے ہیں۔

☆ جو ہم سے محبت کرتے ہیں' اُن کی نظر میں ہم خاص ہیں۔

☆ جو ہم سے دُشمنی کرتے ہیں' اُن کی نظر میں ہم بُرے ہیں۔

☆ ہر شخص کا اپنا ایک الگ نظریہ اور دیکھنے کا طریقہ ہے۔ لہذا دوسروں کی نظر میں اچھا بننے کے پیچھے اپنے آپ کو مت تھکائیے۔ اللہ آپ سے راضی ہو جائے' یہی آپ کے لئے کافی ہے۔ لوگوں کو راضی کرنا ایسا مقصد ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اللہ کو راضی کرنا ایسا مقصد ہے جس کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

oOo

ہاشمی سید وہاج الدین
حیدرآباد

# اُردو ترجمہ قرآن کی پہلی مترجم خاتون
# محمود النساء بیگم

اُردو زبان میں تراجم قرآنی کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں پہلا مکمل ترجمہ شاہ رفیع الدین کا ہے جو قرآن مجید کا لفظی ترجمہ ہے۔ جبکہ شاہ عبدالقادر نے پہلا بامحاورہ ترجمہ کیا تھا، اشاعت کے لحاظ سے بھی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو اولیت حاصل ہے؛ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ اس کے بعد شائع ہوا۔ اُردو میں ترجمہ قرآن کا آغاز سولہویں صدی عیسوی/ دس ہجری سے بتایا جاتا ہے۔ تب سے اب تک اُردو میں سینکڑوں تراجم منظرِ عام پر آچکے۔ اُردو دیگر زبانوں کے مقابلے میں باوجود کم عمر ہونے کے یہ اعزاز رکھتی ہے کہ اس عظیم ومقدس کتاب کے سب سے زیادہ تراجم اسی زبان میں ہوئے ہیں۔ اُردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم کے حوالے سے جتنی بھی تحقیقات کی گئیں ان میں خواتین کا ذکر بالکل سرسری طور پر رہا۔ چونکہ راقم الحروف اُردو میں ترجمہ قرآن کی تاریخ پر تحقیق کررہا ہے، دوران تحقیق مجھے خواتین مترجمین قرآن پر بھی کام کرنے کا خیال آیا اور جب سے میں نے اُردو مترجمین قرآن میں محترمہ محمود النساء بیگم کا نام دیکھا تب سے میری جستجو میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ محض اللہ رب العزت ہی کا احسان ہے کہ میری تحقیق کے آخری مرحلہ میں مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔

محمود النساء بیگم نے قرآن مجید کا اُردو میں ترجمہ ''تفسیر قرآن مجید معہ ترجمہ، احکام قرآن بہ اُردو'' کے نام سے کیا تھا جو 1943ء میں دارالطبع سرکارِ عالیہ، حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔ چونکہ اس کی محدود اشاعت ہوئی تھی، اس لیے بہت جلد یہ مفقود ہوگیا۔ محترمہ کا یہ ترجمہ کافی چھان بین کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوسکا تھا، البتہ اس کے نسخہ کا ذکر ڈاکٹر احمد خان نے اپنے مقالے میں کیا ہے جو کراچی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے(1)۔ اس ترجمہ کے متعلق بس اتنی ہی معلومات تھیں۔ لیکن اب یہ ترجمہ نہ صرف محمود النساء کے افراد خاندان کے پاس محفوظ ہے بلکہ اس پر تحقیق وتالیف کا کام بھی ہوچکا ہے، جس کی تفصیلات یہاں درج کی جاتی ہیں:

مولانا سراج الہدیٰ ندوی ازہری جو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں تفسیر وحدیث کے استاذ ہیں، حیدرآباد کی لڑکیوں کی درس گاہ جامعہ ریاض البنات میں بھی جزوقتی خدمات انجام دیتے ہیں۔ مدرسہ کی صدر معلّمہ محترمہ ذکیہ کوثر کو اپنے درس قرآن کے دوران محترمہ خیرالنساء صاحبہ جو کہ مترجمہ کی منہ بولی بیٹی ہیں، ان کے ذریعہ اس ترجمہ کا علم ہوا۔ چونکہ یہ ترجمہ تقریباً آٹھ دہائی قبل کیا گیا تھا لہٰذا اس کا اسلوب وانداز

اوراس کی زبان کو جدید اسلوب وانداز کی متقاضی تھی۔ چنانچہ اس کاز کے لیے محترمہ ذکیہ موثر کی نظرانتخاب مولانا سراج الہدیٰ پر پڑی۔مولانا لکھتے ہیں:

محترمہ ذکیہ کوثر صاحبہ بہت غور وفکراور استخارے کے بعداس ترجمہ وتفسیر کی پوری ذمہ داری اس بندہ ناتواں کے کمزور کندھوں پرڈالنے کے لیے مصر ہوگئیں"(2)۔

چنانچہ مولانا موصوف نے ساڑھے تین سال کی عرق ریزی سے اس ترجمہ وتفسیر کو جدید انداز واسلوب میں ڈھالا ہے؛ اوراس ترجمہ کو" آسان ترجمہ تفسیر قرآن مجید" کا نام دیا ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کام کوموصوف نے اپریل 2015ء میں مکمل کیا۔ جسے محمودالنساء کے افرادِ خاندان نے شائع کروایا ہے۔مولانا موصوف نے اس ترجمہ میں جوالفاظ متروک ہوچکے ہیں انہیں حذف کرکے انہیں جدید اسلوب وبیان کے مطابق استعمال کیا ہے۔

محمودالنساء بیگم 1898ء میں پیدا ہوئیں، آپ کے والد کا نام سید محمد یوسف الدین تھا جوگلبرگہ کے صوبہ دار تھے۔ والدہ نجم النساء بیگم کا تعلق حیدرآباد کے جاگیردار خاندان سے تھا۔آپ کے والد سید محمد یوسف الدین حکومت نظام میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ یوسف الدین صاحب نے اپنی اولاد کی تعلیم تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ محمودانساء علمی دنیا میں نہ صرف اپنا بلکہ اپنے خاندان کا نام اس حدتک روشن کرگئیں کہ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کے ترجمہ میں اولین خاتون ہونے کا اعزاز اپنے نام کرگئیں۔

موصوفہ کے اساتذہ کرام کے بارے معلومات تو حاصل نہ ہوسکیں، البتہ آپ کے والد صاحب کی بہترین تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں آپ کو عربی،اردو ،فارسی اور انگریزی زبانوں میں عبور حاصل تھا۔محترمہ کے اہل خاندان ان کے علم وفضل کی گواہی دیتے ہیں، اورقرآن کریم سے ان کے گہرے لگاو کو بیان کرتے ہیں۔آپ کا نکاح 17 سال کی عمر میں ایڈوکیٹ عبدالغفور حسینی بلڈنگ معظم جاہی مارکیٹ،حیدرآباد کے فرزند جناب محمد عبداللہ حسین سے ہوا؛ آپ دوسری اہلیہ تھیں۔ موصوفہ کی عمر ابھی صرف 30 سال ہی تھی کہ 13 سالہ ازدواجی رفاقت کے بعد محمد حسین وفات پاگئے۔اس طرح کم عمر ہی میں آپ بیوہ ہوگئیں، مترجمہ کی کوئی اولاد نہیں تھی ،لہٰذا آپ نے اپنی ایک بھتیجی خیرالنساء کو اپنی منہ بولی بیٹی بنالیا اور تاحیات اپنے ساتھ رکھا۔

شوہر کے انتقال کے بعد محمودالنساء بیگم نے اپنے آپ کو خدمتِ قرآن کے لیے وقف کردیا؛ اور تاحیات اذکار وعبادات کے ساتھ مطالعہ قرآن اوراس کے ترجمہ وتفسیر میں لگی رہیں۔محترمہ چونکہ دین کا گہرا علم رکھتی تھیں اور ساتھ ہی ایک باعمل خاتون تھیں۔اللہ نے مرحومہ کوفن طب کا بھی علم دے رکھا تھا بالخصوص ٹی بی، جذام اور ہیضہ کی دوائیاں جووہ خود اپنی ہاتھ سے بناتی تھیں جس میں کافی تاثیر ہوتی تھی اور مریضوں کوشفا بھی۔ضرورت مندوں اور غریبوں کا بلا معاوضہ علاج کرتی تھیں۔

اردو تراجم قرآن کی تاریخ میں جہاں مردوں میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کو اولیت کا شرف حاصل ہے وہیں اولین خواتین مترجمین قرآن میں محمودالنساء بیگم کو یہ

اعزاز حاصل ہے۔قرآن مجید کے اردو تراجم کے حوالے سے اب تک صرف مردوں ہی کی خدمات کے تذکرے ہوتے رہے ،خواتین کی خدمات پر اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔الحمدللہ راقم کے مقالہ میں ایک باب اسی موضوع پر ہے۔؛ اب تک تقریباً تین خواتین کو اردو زبان میں مکمل ترجمہ وتفسیر کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔جن میں دو کا تعلق ہندوستان سے ہے، محمودالنساء بیگم اور ثریا شحنہ، جبکہ ڈاکٹر رفعت اعجاز کا تعلق پاکستان سے ہے۔آخرالذکر دو تراجم اکیسویں صدی میں کیے گئے ہیں۔ ثریا شحنہ کا ترجمہ 2012ء میں تبیین القرآن فی تفسیر القرآن کے نام سے ؛ جبکہ ڈاکٹر رفعت اعجاز کا ترجمہ وتفسیر ' مفہوم القرآن' کے نام سے اکتوبر 2006ء میں منظر عام پر آیا۔

محترمہ محمودالنساء نے 1943ء/ 4 محرم الحرام 1362 ہجری میں تفسیر قرآن مجید معہ ترجمہ،احکام قرآن بہ اردو سے قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی مختصر تفسیر لکھی، 621 صفحات کے ساتھ یہ ترجمہ وتفسیر ٹائٹل،سب ٹائٹل اور دو صفحات پر مترجمہ کی لکھی تمہید پر مشتمل ہے۔موصوفہ نے اس ترجمہ وتفسیر کے لیے شاہ عبدالقادر اور مولانا محمود حسن کے تراجم سے استفادہ کیا ہے، جس کا اظہار مولفہ نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے:

"قرآن شریف کا یہ ترجمہ مولانا محمود حسن صاحب کے اس مستند ترجمہ کا اقتباس مع تفسیر موضح قران ہے،بعض فوائد اس میں شاہ عبدالقادر صاحب کے ہیں"(3)۔علاوہ ازیں دیگر تراجم وتفاسیر بھی موصوفہ کے پیش نظر رہیں، اس طرح 1943ء میں آپ کو یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ ' تفسیر قرآن مجید معہ ترجمہ،احکام قرآن بہ اردو' کے نام سے آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر لکھ کر اولین خاتون مترجم قرآن کا مقام حاصل کرلیا۔

اس کے آگے محترمہ نے اس ترجمہ کو لکھنے کی غرض وغایت کو بھی واضح کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"اس کے لکھنے کی غایت صرف یہ ہوئی کہ جو لوگ قرآن شریف نہیں پڑھائے گئے ہیں یا نہیں پڑھ سکتے ہیں؛ مگر اردو میں خاصی مہارت رکھتے ہیں، وہ کم ازکم اپنی مادری زبان ہی میں پڑھ کر واقف تو ہوسکیں کہ کلام الٰہی میں ہمارے لیے کیا احکام آئے ہیں،افسوس کہ عربی نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے اپنی مذہبی کتاب مقدس ہی سے لاعلم رہ جاتے ہیں،جس کا پڑھنا اور سمجھنا ازبس ضروری ہے،ناچیز کا مقصد محض یہی ہے کہ لوگ اس کتابِ مقدس کے فیوض سے محروم نہ رہیں"(4)۔

بیسویں صدی کا یہ وہ دور تھا جس میں قران مجید کے تراجم کا گویا ایک سیلِ رواں جاری تھا،اس صدی کو قرآنی تراجم کا سنہری دور بھی کہا گیا ہے۔اس دور میں جہاں قرآن مجید کے شاہکار تراجم وتفاسیر معرض وجود میں آئے وہیں ایسے تراجم وتفاسیر لکھے گئے کہ جو شریعت اسلامی کے مغائر تھے۔مترجمہ موصوفہ کا یہ ترجمہ اور تفسیر اسی دور کی تالیف ہے۔قرآنی فکر کو عام کرنے اور قرآن فہمی کو لے کر محترمہ کتنی تڑپ رکھتی تھیں اس کا اندازہ محترمہ کے مقدمہ میں لکھے گئے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"جو لوگ عربی جانتے ہیں ان کے لیے ترجمہ کی تو ضرورت ہی نہیں،خود سمجھ لیتے ہیں،عربی نہ سمجھنے والوں کے لیے با ترجمہ قرآن مجید بہت ہیں،مگر عربی کے احترام کی وجہ سے ہر

کس وناکس کا ان کو چھونا یا پڑھنا یا بے محل حمل ونقل بے ادبی سے خالی نہیں، بے تکلفی سے ہر شخص پڑھ نہیں سکتا، دنیوی امور میں سینکڑوں دشوار گزار راستے انسان چلتا ہے؛ لیکن مذہبی امور میں ذرا سی مشکل مل جائے تو حیلہ جوئی کرتا ہے؛ اس لیے آسان سے آسان تر طریقہ سے مسلمانوں کی سمجھ میں اپنا مذہب آجائے ،بس یہی گنہگار کا مقصد ہے، محض ان سہولتوں کا لحاظ کرتے اور نہ پڑھنے کے عذرات کو دور کرنے کی غرض سے یہ ترجمہ لکھا گیا ہے؛ تاکہ مسلمان پیدا ہونے یا اسلام قبول کرنے کا اصل مقصد اس کے پڑھنے سے واضح ہوجائے"(5)۔

فقہی بحث سے ہٹ کر کہ آیا متن قرآنی کے بغیر ترجمہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں موصوفہ مسلمانوں میں قرآن فہمی کو لے کر کتنی زیادہ فکرمند اور تڑپ رکھتی تھیں یہ معلوم ہوتا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ موصوفہ نے عملی طور پر بھی اس کام کو انجام دیا۔اسی بناء پر محترمہ محمودالنساء نے بغیر متن قرآنی کے صرف ترجمہ قرآن ہی رکھا ہے تاکہ قرآن فہمی میں حائل تساہل اور کاہلی کے لیے کوئی جواز باقی نہ رہ سکے۔اور اس کے جواز میں انہوں نے دارالقضاء ودارالافتاء دارالعلوم قادریہ عالیہ، بدایوں سے فتویٰ بھی حاصل کیا تھا جس کا ذکر انہوں نے مقدمہ میں کیا ہے(6)۔

محترمہ کا یہ ترجمہ اپنے زمانے کی زبان وبیان اور انداز واسلوب کے لحاظ سے بہترین ترجمہ رہا ہے۔محترمہ نے قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کے دوران قوسین کے ذریعہ الفاظ کی بہت عمدہ وضاحت پیش کی ہے۔ بامحاورہ ترجمہ ہونے کی وجہ سے بہت عام فہم اور آسان ہے۔ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی بھی ہیں جن میں مولانا محمود حسن کی حواشی بھی شامل ہیں بلکہ بعض جگہ بعینہ حواشی بھی ہیں۔اس کے علاوہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ وتفسیر سے بعض جگہوں پر موصوفہ نے تفسیری فوائد کو بھی شامل کیا ہے۔

جیسا کہ مترجمہ نے تمہید میں یہ بات واضح کردی تھی کہ غیر عربی دان حضرات کے لیے قرآن کو سمجھنے میں معمولی سا عذر بھی نہ رہے اس لیے بلامتن ترجمہ کیا ہے۔اسی لیے اس ترجمہ وتفسیر میں فقہی مسائل سے مکمل طور پر اجتناب کیا گیا ہے۔ترجمہ میں املے کی غلطیوں کے علاوہ آیت نمبر بھی نہیں لکھا ہے۔

**نمونہ ترجمہ سورہ الناس:**

(یعنی اے پیغمبر!) تم کہو کہ، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے پروردگار کی۔لوگوں کے (حقیقی) بادشاہ کی۔لوگوں کے معبود (برحق یعنی خدا) کی۔شر سے اس (شیطان کے) جو وسوسے ڈالتا (اور خود) نظر نہیں آتا۔ وہ جو (بہکانے والے) خیالات لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔جنات میں اور آدمیوں میں۔

## حوالے:


1۔ قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات): ڈاکٹر احمد خان،ص:248,249،مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، 1987

2۔ ابتدائیہ،آسان ترجمہ وتفسیر قرآن مجید: مولانا سراج الہدیٰ ندوی ازہری،ص۔12، ناشر،محترمہ خیرالنساء صاحبہ مع آل و اولاد، جامعہ ریاض البنات، حیدرآباد

3۔ مقدمہ تفسیر قرآن مجید معہ ترجمہ ،احکام قرآن بہ اردو: محمودالنساء، دارالطبع سرکارِ عالیہ، حیدرآباد

4۔ایضاً' 5۔ایضاً' 6۔ایضاً


☆☆☆

سیدہ سارہ سلطانہ
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500 (تلنگانہ)

# ہندوستانی سماج میں لڑکی کا مقام و مرتبہ

## (مختلف طبقات کے حوالے سے ایک مطالعہ)

ہندوستان سماج میں کئی مذاہب کے ماننے والوں کا گہوارہ رہا ہے ۔ India is a multi religious, multi cultural and multi linguistic country یہاں کے سماج پر زمانہ قدیم سے مذہب کا گہرا اثر رہا ہے۔ مذہب کے لفظی معنی کسی چیز سے جڑ جانے کے یا کسی سے باندھنے کے ہیں یا یہ ایک متحدہ نظام ہے جو عقائد نظریات اور رسومات پر مشتمل ہے۔

مذہب کا بنیادی مقصد نہ صرف انسانی زندگی کی تزئین وتہذیب پر بھرپور اثرات مرتب کرنا ہے بلکہ انسانی فلاح وبقا کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل بھی فراہم کرنا ہے جو کہ سماجی اصولوں کی تعمیر وتشکیل کی بنیاد بنتا رہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں لڑکیوں کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے مختلف مذہبی عقائد ونظریات جو کہ فرد کی سماجی ، اقتصادی ، مذہبی اور نجی زندگی کے اختیارات کا رفرما ہوتے ہیں اور جو عملی میدان کا تعین کم کر دیتے ہیں۔

**ہندو دھرم :** ہندو دھرم کا دور ایسا دور رہا ہے جہاں خواتین و مرد دونوں برابر مقام و مرتبے پر فائز ہے۔ مابعد ویدک دور لڑکی کے مقام میں بدلاؤ اور سماجی بدعت کا سلسلہ شروع ہوا رام شدن کا قول ہے کہ ''معاشرہ میں لوگوں کی عام تمنا یہی ہوتی ہے کہ بیٹا پیدا ہو اور خاص دیوتاوں کی پوجا کی جاتی ہے کہ بیٹا پیدا ہو۔ بیٹی کے پیدا ہونے پر نہ خوشی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ وراثت میں لڑکی کو حصہ دیا جاتا ہے''۔ استری دھن (جہیز) کی صورت میں اس کو وراثت دی جاتی ہے۔

رومیلا تھاپر کا قول اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ''بیٹیوں کی پیدائش کے لئے جگہ جگہ دعائیں ملتی ہیں۔ تھاپر کہتے ہیں کہ رگ وید کے حوالے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عورت، شودر اور ویشیا ایک ہی زمرے میں شامل ہیں''

ہندومت یا ہندو مذہب میں دھرم شاشتر کی بنیاد پر کئی ایک سمرتیاں لکھی گئی جس کو قانونی حیثیت حاصل رہی اور ان میں منوسمرتی بہت مشہور ہے۔ منوسمرتی کا نظریہ لڑکی کے لئے منفی کردار پیش کرتا ہے۔

بیٹی باپ کی نگرانی میں ہوتی ہے، شادی کے بعد شوہر کی نگرانی میں جو کہ شوہر کی اردھانگنی تصور کی جاتی ہے۔ لڑکی بالغ ہونے سے پہلے اس کی شادی کر دینی چاہئے ورنہ

باپ گناہ مرتکب ہوگا۔

منوکا نظریہ ایک طرف لڑکی کے پیدا ہونے پر دیوتاؤں کی خوشی کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف شادی کے بعد عورت بیٹا پیدا کرنا اور ماں بننا کو ثابت کرتا ہے۔ بیٹا نہ ہونے اور لڑکیاں پیدا ہونے پر عورت کو قصوروار مانتا ہے۔

ویدک دور، رامائن ،مہابھارت ، ہندو دھرم کی طویل تاریخ میں حسین دور کہلاتے ہیں لیکن چند ایک امور (جیسا کہ مہابھارت میں ماں کی قربانی مثالی ہوتی ہے اس کا درجہ باپ کے درجہ سے دس گناہ زیادہ بتایا جاتا ہے ) کو چھوڑ کر لڑکیوں کے مقام و مرتبہ کو لے کر مختلف نظریات وعقائد عمل پیرا ہوتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کا مثالی دور لڑکیوں کے لئے یہ تصور پیش کرتا ہے کہ لڑکی خاندان کے لئے منحوس اور دکھ کا باعث ہے۔ لڑکی کی پیدائش کو اچھی اور خوشی کی نیت سے نہیں دیکھا جاتا، ساتھ دوسری پیدائش پر بیٹے کے لئے دعا مانگی جاتی ہے۔ اس طرح بیٹے کی خواہش لڑکی کے مقام و مرتبہ میں تبدیلی لائی۔ بیٹی کو پریشانی، بیٹے کو فردوس بریں تصور کیا جانے لگا۔

ہندومت کے مختلف نظریات جیسا کہ لڑکی کا کنیہ دان باپ کے لئے فرض کا پیشہ ہوتا ہے اور کم عمری میں شادی کردی جائے تو نجات کا ذریعہ ہوگا۔ ہندو دھرم کی کتابوں میں صنف نازک کے کردار کو ستائشی الفاظ دروپدی اور پاروتی کا قول کہ ''شوہر سے ہٹ کر کوئی اور خدا نہیں ہے'' یہ نظریات وعقائد صاف صاف اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ لڑکی کا کوئی وجود و مقام نہیں۔ شادی کے بعد وہ شوہر کی اردھانگنی ہے۔ (آدھا بدن نصف بہتر)۔

**عیسائیت:** ہندوستانی معاشرہ میں متعدد فرقوں، مذاہب اور ذاتوں کے بناء پر عیسائیت میں بھی لڑکیوں کے متعلق عقائد ونظریات خلط ملط ظاہر ہوتے ہیں۔ عیسائیت میں لڑکیوں کو آزادی اس حد تک دی گئی ہے کہ بغیر شادی کے اپنی ساری زندگی سماجی خدمت میں صرف کرسکتی ہیں۔ اور یہ تصور رہا کہ عورت مرد کو غارت کرنے والی ہے۔ غیر شادی شدہ لڑکی ضرورت مندوں کی خدمت کرنے والی ہوتی ہے' محبت کرنے والی، اپنے ہاتھ سے کام کرنے والی ہوتی ہے۔

ابتدائی دور کے مفکرین ٹرٹولین Tertulian اور کرائی سوسٹم (Chry Sostam) عورت کو شیطان کے آنے کا دروازہ کہتے ہیں۔ عورت کو شرم کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔

بائبل میں حضرت حوا علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں اس طرح کی روایات نقل کی ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آدم پر گہری نیند طاری کی اور وہ سوگیا۔ آدم کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکال کر اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اس ایک پسلی سے عورت کو بنا کر اسے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا تو میرے ہڈیوں میں سے ایک ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس لئے وہ نار کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔

**سکھ مذہب:** سکھ مذہب کے بانی گرونانک 1469-1539 کے دور میں گذرے ہیں۔ یہ وہ دور رہا جب ہر اعتبار سے لڑکیوں کے مقام و مرتبہ میں گراوٹ

اورعورت کو کمزور ونجس تصور دے رکھا تھا ۔ذات پات کی بنیاد پر،معاشی اعتبار سے اوروراثت کے حقوق سے لڑکیوں کومحروم رکھا گیا ۔لڑکی کے مقام وعورت کی عزت وقار کے لئے گرونانک نے برادری کا درس دیا ۔سکھ مذہب کے گروامرداس سنگھ نے سماجی ، معاشی ، سیاسی ذمہ داری کے لئے برابری کا مقام دیا ۔نہ لڑکی تعلیم پر پابندی لگائی اور نہ مذہبی خدمات میں روک ٹوک کی ۔

سکھ ازم میں بیوی اورشوہر ایک دوسرے کے ساتھی، دوجسم ایک آتما ہوتے ہیں ( Guru Grant Sahebji-788) عورت کی ناپاکی کا کوئی تصورنہیں ۔کیرتن ،اکھنڈپاٹ کی پوری آزادی سکھ مذہب میں پائی جاتی ہے۔

گرونانک کا قول عورت کی عظمت کے بارے میں:

1۔ عورت سے ہی آدمی کا جنم ہوا۔

2۔ عورت سے ہی نسل پیدا ہوتی ہے۔

3۔ عورت سے ہی آدمی شخصیت ساز ہوتا ہے۔

4۔ عورت سے ہی ہماری شادیاں ہوئیں۔

5۔ عورت سے ہی ہمارا خاندان ہے۔

6۔ عورت کے بغیر کچھ نہیں پھر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ عورت شیطان کی جڑ ہے (سری گروگرنت صاحب جی 473-)

**مذہب اسلام:** مذہب اسلام وہ مذہب ہے جس نے زندگی کی رنگارنگی ،اس کے نشیب وفراز میں عورت اورمرد دونوں کو ایک دوسرے کے لئے معاون ومددگا ثابت کیا ۔یعنی اسلام میں لڑکا،لڑکی یامردوعورت دونوں برابر ہیں ۔

''اللہ تعالیٰ زمین اورآسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' جوکچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے ، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے ، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے ، جسے چاہتا ہے لڑکے لڑکیاں ملاجلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے' وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے''

(سورۃ الشوریٰ ۔آیت نمبر ۵۰۔۵۹)

ظہوراسلام سے قبل لڑکی کے مقام کو لے کر جوروایات ملتی ہیں وہ ظالمانہ اورسنگدلانہ تھیں ۔لڑکی یاعورت کوکسی جانور سے کم تصور کیا جاتا ۔لڑکی سماجی لعنت ، منحوس اور باعث عار سمجھی جاتی ۔باپ کا چہرہ غم کے مارے سیاہ پڑ جاتا یاغم وغصہ کے مارے یہ سوچ لیتا کہ اس ذلت کو زندہ رکھوں یامٹی میں دفن کردوں ۔

جہالت کے معاشرے میں اسلام ہی وہ مذہب رہا ہے جولڑکی کی حیثیت اورعورتوں کے مقام ومرتبہ کو اندھیرے سے روشنی کی طرف ابھارتا ہے ۔لڑکی کے مقام کو گہری کھائی سے نکال کر اونچے مقام پر لاتا ہے ۔یہ اسلام ہی ہے جو لڑکی کی تولدکو باعث خیروبرکت اورمال و جائیداد میں اضافہ کا سبب ظاہر کیا۔

حدیث سے ثابت ہے'' جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو خیروبرکت لے کر جاتا ہے'' لڑکیوں کو فقروفاقہ کے ڈر سے قتل کرنے پر مذہب اسلام اسکی سخت مخالفت کرتا ہے ۔لڑکیوں اورلڑکوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے اورعدل قائم کرنے کی ترغیب

دیتا ہے۔

اسلام لڑکیوں اور لڑکوں کو یکساں تعلیم اور اچھی تربیت کا حکم دیتا ہے۔شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیا۔والدین یا بھائی کی جائیدادوں میں حصہ دار بنایا۔حدیث شریف کے حوالے سے لڑکی کی تربیت ''پرورش'' اچھا سلوک (اور شادی) کرنے پر جنت کا حقدار ثابت کرتا ہے'' اسلام نے لڑکی کے حق میں اتنی بڑی فضیلت بیان کی ہے جو کسی اور مذہب میں اس کے بارے میں ظاہر نہیں ہوا۔اسلام کی نظر میں بہو کا رشتہ قابل احترام اور مقدس مانا گیا۔

عورت اگر بیوہ ہوتی ہے تو خدا کی قدرت و حکمت کے تحت ہوتی ہے۔بیوگی عورت کے لئے بڑا داغ، نحوست اور بدقسمتی تصور کی جاتی ہے۔بدنصیبی کا یہ احساس بعض اوقات خودکشی پر مجبور کر دیتا ہے۔بیوہ یا مطلقہ عورت تنہا واپس باپ یا بھائی کے گھر آتی ہے تو اسلام اس کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کرتا ہے۔اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ یہ عورت ہمارے حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے۔

الغرض مذہب اسلام نے قرآنی تعلیمات کی رو سے لڑکی کے مقام و مرتبہ اور ایک عورت کی ذاتی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔خواتین کے حقوق وہی حقوق ہیں جو مرد کو معاشرہ میں حاصل ہیں۔مساویانہ نقطہ نظر سے نہ لڑکے کو لڑکی پر فوقیت دی اور نہ مرد کو عورت پر۔تاکہ نہ مرد کو مطلق العنانی حاصل ہو اور نہ عورت کو ظلم و استبداد کا شکار ہونا پڑے۔

متذکرہ مضمون لڑکیوں کے مقام و مرتبہ، مختلف مذاہب کے حوالے سے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ الگ الگ مذاہب میں لڑکی کے مقام و مرتبہ کو لے کر جو عقائد پائے جاتے ہیں ان پر روشنی ڈالی جائے۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مذہبی عقائد کی بنیاد پر کسی فرد کو ٹھیس پہنچائی جائے۔اس ضمن میں مختلف کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔


۱۔ آمنہ تحسین مطالعات نسواں۔۔۲۰۰۸ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ص:۴۴،۷۰

۲۔ توحید خان۔ڈاکٹر مرزا رسوا کے ناول کے نسوانی کردار۔ ۱۹۹۵ تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی۔

۳۔ سید حسن نقوی۔ہمارا قدیم سماج۔۱۹۸۳الاھوتی، پبلشرز نئی دہلی۔ص:۱۱۹۔

۴۔ عبدالرشید بستوی۔عورت اسلام کے سائے میں۔۲۰۰۵ فرید بک ڈپو۔نئی دہلی۔

۵۔ محمد شہزاد شمس۔عورت اور سماج۔۲۰۱۱۔ تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی۔ص: ۲۲۔

۶۔ نانک سنگھ نشتر۔گرو گرنتھ صاحب۔۲۰۰۳۔نشتر پبلکیشنز نئی دہلی۔ص:۲۲

۷۔ زاہدہ حنا۔عورت زندگی کا زنداں۔۲۰۰۶، تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی۔ص:۱۲۳۔

۸۔ تفہیم القرآن جلد چہارم۔ابوالاعلی مودودی۔ص ۵۱۵


☆☆☆

ڈاکٹر جاں نثار معین
مدینہ پولٹری
ریلوے گیٹ، احمد نگر کالونی، ظہیر آباد، تلنگانہ

# ویلن ٹائن ڈے

**تلخیص:**

یوم عاشقان کو ویلن ٹائن ڈے کہتے ہیں۔اس دن عاشق اپنے محبوب کو تحفہ دیکر محبت نبھانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ قدیم 'یونان' اور 'روم' میں زرخیزی اور کاشتکاری کے دیوتا Lupercalia کا دن 15 فروری کو منایا جاتا تھا۔اسی دن نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسی دن رومی سلطنت کے علاوہ تمام مغربی دنیا میں 'یوم عاشقان' منایا جانے لگا۔اس دن محبت کرنے والے عاشق اور معشوقہ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرنے سے قبل تحفہ میں کارڈس، چاکلیٹ یا پھول دیتے ہیں۔اس دن انجانے افراد بھی اپنی پسند کی لڑکی سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔جس سے مشرقی تہذیب متاثر ہورہی ہے۔ اس عید سے بیشتر ازدواجی زندگیوں میں دراڑیں پیدا ہورہی ہیں۔غیر اخلاقی رسم سے شریف النفس لوگوں کی پاک دامنی متاثر ہورہی ہے۔چوں کہ اس دن بے حیائی اور بے راہ روی عام ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس کو ماڈرن سمجھا جاتا ہے۔جب کہ مشرقی تہذیب وتمدن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔اس کے باوجود خوبصورت پیار بھری عید نوجوانوں میں مقبول ہورہی ہے۔اس لیے ہم نے اس دن سے آگہی کی خاطر عنوان کا انتخاب کیا ہے۔ یہ مضمون مشرقی ومغربی دونوں تہذیبوں کی عکاسی کرتا ہے۔اس تحقیق کا بنیادی مقصد عاشقوں کی عید سے پیدا ہونے والی فحش، عریانیت اور بے راہ روی سے آگہی کرنا ہے۔

**کلیدی الفاظ:** ویلن ٹائن ڈے، تاریخ، مشرقی تہذیب۔

1۔ **تمہید :** یوم عاشقہ رومن بت پرستوں کی عیدوں میں سے ہے۔ یہ تصور سترہ صدیوں سے ہے۔رومیوں اوران کے وارثین عیسائیوں کے یہاں داستانیں اور کہانیاں زیادہ مقبول رومیوں کے اعتقاد کے مطابق شہر روما کے مؤسّس (روملیوس) کو ایک دن کسی مادہ بھیڑیا نے دودھ پلایا جس کی وجہ سے اسے قوت فکری اور حلم وبردباری حاصل ہوگئی، اسی لیے رومی ہر سال فروری کو کتا اور بکری ذبح کرکے دو طاقتور مضبوط نوجوان اپنے جسم پر ان جانوروں کے خون کا لیپ کرتے تھے۔اس خون کو دودھ سے دھوت کے بعد ایک بڑا قافلہ سڑکوں پر نکلتا جس کی قیادت دونوں نوجوانوں کے ہاتھ میں ہوتی، دونوں نوجوان اپنے ساتھ ہاتھ میں چمڑے کے دو ٹکڑے لے کر جو بھی انہیں

ملتے انہیں مارتے اور رومی خواتین بڑی خوشی سے اس مار کو اس اعتقاد سے قبول کرتیں کہ اس سے شفا اور بانجھ پن دور ہوگا۔

یوم محبت بھی دوسری عیدوں کی طرح خوشی وسرور سے منایا جاتا ہے' اس دن سرخ گلاب کے پھولوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ یہ کام بت پرستوں کی حب الٰہی اور نصاری کے باب عشق کی تعبیر میں کرتے ہیں۔ اسی لئے اس کو عاشقوں کی عید کہا جاتا ہے۔ اس دن کارڈوں کی تقسیم کی جاتی ہے جن میں کیوپڈ جو ایک بچے کی خیالی تصویر ہوتی ہے' اس کے دو پیر ہیں' اس نے تیر کمان اٹھا رکھا ہے۔ جسے رومی بت پرست محبت کا الہ مانتے ہیں۔ ان کارڈوں پر محبت وعشقیہ کلمات ہوتے ہیں۔ ان پر بعض اقوال گندے اور ہنسانے والی تصویریں ہوتی ہیں۔ عام طور پر "ولنٹائینی ہو جاؤ" لکھا ہوتا ہے۔ جو بت پرستی سے منتقل ہو کر نصرانی مفہوم کی تمثیل بنی۔ اس طرح نصرانی دن میں بھی محفلیں سجاتے، اور رات کو مرد وزن دونوں رقص وسرور کرتے تھے۔ پھر پھول، چاکلیٹ بطور تحفہ اپنے چاہنے والوں کو بھیجتے ہیں۔

اس طرح یہ دن رومی بت پرستوں کا عقیدہ بن گیا۔ رومیوں کے یہاں اس دن کی ابتدا قصے کہانیوں اور خرافات پر تھی۔ جیسے مادہ بھیڑیے کا شہر روم کے مؤسّس کو دودھ پلانا جو حلم وبردباری اور قوت فکر میں زیادتی کا سبب ہے، یہ عقل کے خلاف عمل تھا۔ کیوں کہ حلم وبردباری اور قوت فکر میں اضافہ کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس عید سے بشب ویلنٹائن کے مرتبط ہونے میں کئی ایک مصادر نے شک کا اظہار کیا ہے اور اسے وہ صحیح نہیں مانتے۔ یہاں تک کہ عیسائی علماء نے اس عید کو اٹلی میں منانے پر پابندی لگا دی۔ ان خیال میں لڑکوں و لڑکیوں کی عقلوں پر برا اثر پڑتا ہے اور فحاشی وزناکاری عام ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک غیر مستند خیال ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں ویلنٹائن نام کے ایک پادری تھے جو ایک راہبہ (Nun) کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے۔ چوں کہ عیسائیت میں راہبوں اور راہبات کی شادی ممنوع ہوتی ہے۔ اس لیے ایک دن ویلن ٹائن نے اپنی معشوقہ کی تشفی کے لیے بتایا کہ اسے خواب میں بتایا گیا ہے کہ 14 فروری کا دن کو اگر کوئی راہب یا راہبہ صنفی ملاپ کرلیں تو گناہ نہیں ہوگا۔ راہبہ نے اس پر یقین کیا اور دونوں جوشِ عشق میں سب کچھ کر گزرے۔ کلیسا کی روایات کی یوں دھجیاں اُڑانے پر ان کا حشر وہی ہوا جو عموماً ہوا کرتا ہے یعنی انہیں 14 فروری 279 عیسوی کو قتل کر دیا گیا۔ بعد میں کچھ منچلوں نے ویلن ٹائن صاحب کو 'شہیدِ محبت' کے درجہ پر فائز کرتے ہوئے ان کی یاد میں عاشقوں کی عید (Lover's festival) کے طور پر منانا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں بک آف نالج کا خیال ہے ''ویلن ٹائن ڈے کے بارے میں یقین سے کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز ایک رومی عید لوپر کالیا (LuperCalia ) کی صورت میں ہوا۔ قدیم رومی مرد اس دن اپنی دوست لڑکیوں کے نام اپنی آستینوں پر لگاتے اور تحائف دیتے تھے۔ اس طرح اس دن کو سینٹ 'ویلن ٹائن' کے نام منسوب کر دیا۔ بعد میں ہر سال اس دن نوجوان اپنے رفیق یا رفیقہ حیات سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

سترہویں صدی کی ایک دوشیزہ سے یہ منسوب ہے کہ اس نے ویلن ٹائن ڈے کی رات کو سونے سے قبل تکیہ کے ساتھ پانچ پتے ٹانکے تا کہ وہ خواب میں اپنے ہونے والے

خاوند کو دیکھ سکے گی۔ بعد ازاں لوگوں نے تحائف کی جگہ ویلنٹائن کارڈز کا سلسلہ شروع کر دیا۔اس دن سے متعلق ایک سیکولر نظریہ ہے کہ ویلن ٹائن ڈے خوشیاں اور محبتیں بانٹنے کا دن ہے اوراس دن اگر خاوند اپنی بیوی کو از راہِ محبت پھول پیش کرے یا بیوی اپنے سرتاج کے سامنے چند محبت آمیز کلمات کہہ لے تو اس میں آخر حرج کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم نے مدلل بحث کی ہے۔ چوں کہ دنیا بھر میں خیالی محبوباؤں کا تصور عام رہا ہے۔ جیسے شہر حیدرآباد سے مشہور ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی تھی۔اسی رومانی خیالی محبوبہ کی یاد میں ملا وجہی نے 'قطب مشتری' لکھ دی۔اسی طرح سے پدماوتی کا قصہ بھی مشہور ہے۔اس طرح فہرست طویل ہے۔اسی طرح سے لوگ اپنی ناکامی یا ہوس کو بجھانے کے لئے اس دن تحفے میں پھول اور خطوط دے کر اپنی جنسی ہوس کا شکار بنانے کے لئے دنیا بھر میں بطور عید مناتے ہیں جو غیر اخلاقی رسم بن گئی ہے۔ اسی لیے ہم نے ویلن ٹائن ڈے کا تاریخ کی روشنی میں خلاصہ کیا ہے کہ یہ کیسی غیر ضروری رسم ہے جس سے مرد وزن دونوں بے راہ روی کے شکار ہو رہے ہیں۔فحش کلچر کو فروغ مل رہا ہے۔ اس برائی سے کیسے مشرقی تہذیب کو بچائیں۔اس فکر کے تحت ہم نے یہ مقالہ قلم بند کیا ہے۔

سائنسی نقطہ نظر سے نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح کے ماحول سے جنسی تلذذ حاصل ہوتا ہے۔ جب کسی بھی قوم کے نوجوان غلط راہ اختیار کرتے ہیں تو وہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے یوم عاشقہ پر پابندی لگا دینا چاہیے۔ اس دن کو یوم سیاہ تصور کرنا چاہیے۔اسی لیے ہم نے تاریخ کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی ہے کہ کیسے یوم عاشقہ سے انسانیت شرمندہ ہو رہی ہے۔ اور اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کیا اقدامات اٹھانے چاہیے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو ہر دانشور کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔اس اعتبار سے بھی اس عنوان پر تحقیقی کام ضروری تھا۔ اسی لیے ہم نے اس عنوان پر مضمون لکھنا ضروری سمجھا۔ چوں کہ اسلام میں غیر مردوں اور غیر خواتین کا ایک دوسروں سے ملنا اور اظہار محبت کرنا منع ہے۔مسیحی نقطہ نظر میں بھی چرچ نے ان خرافات کی ہمیشہ مذمت کی اور اسے جنسی بے راہ روی کی تبلیغ پر مبنی قرار دیا۔ یہی وجہ ہے عیسائی پادریوں نے بھی اس دن کی مذمت میں سخت بیانات دیے۔ بنکاک کے ایک عیسائی پادری نے بعض افراد کو لے کر ایک ایسی دکان کو نذر آتش کر دیا جس پر ویلن ٹائن کارڈ فروخت ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سال اس دن دنیا بھر کے تمام روشن خیال یوم عاشقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

2۔ **تعارف:** انسان ازل سے ہی محبت کا متلاشی رہا ہے لیکن ہر ایک کی پسند منفرد ہوتی ہے۔ مذاہب کے تصور میں محبت، پیار اور اخوت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔مگر محبت کو ویلن ٹائن ڈے کے نام پر غلط رنگ دے کر محبت کی پاکیزگی پر قدغن لگایا جا رہا ہے۔محبت کو ہوس اور بے راہروی کا رنگ دیا جا رہا ہے۔ جس سے بہت ساری غلط صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔اس دن جو بھی محبت کا دعوے دار ہوتا ہے وہ خوشی وسرور کا اظہار کرتا ہے' آپس میں سرخ گلاب کے پھولوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ بت پرستوں کی حب الٰہی اور نصاری کے ہاں عشق کی تعبیر ہے اسی لیے اس کا نام بھی ''عاشقوں کی عید'' ہے۔اس خوشی میں

کارڈوں کی تقسیم کی جاتی ہے۔جن پر کیوپڈ کی خیالی تصویر بنی ہوتی ہے۔اس کے دو پر ہیں اوراس نے تیرکمان اٹھارکھا ہے، جسے رومی بت پرست قوم محبت کا الہ مانتے ہیں۔کارڈوں میں محبت وعشقیہ کلمات بھی ہوتے ہیں۔بعض کارڈوں پر گندے قسم کے اقوال اور ہنسانے والی تصویریں ہوتی ہیں ، اوراکثر ولنٹائینی بن جاؤ، جوکہ بت پرستی کے مفہوم سے منتقل ہوکر نصرانی مفہوم کی تمثیل ہے۔بہت سے نصرانی علاقوں میں دن کے وقت بھی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔رات کو مرد وزن دونوں مل کر رقص وسرور میں مگن ہوتے ہیں۔بہت سے لوگ پھول، چاکلیٹ کے پیکٹ وغیرہ بطورتحفہ دیتے ہیں۔

ربی انسائیکلوپیڈیا (الموسوہ العربی) کے مطابق ویلن ٹائن ڈے کو کارڈوں پر عشقیہ اورمحبت کے اشعارلکھ کر اپنے عزیزواقارب میں تقسیم کرنا شامل ہے۔بعض توان کارڈوں پر مضحکہ خیز تصاویر بنا کر لکھتے ہیں ویلنٹائنی ہوجاؤ' اور رقص وسرور کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔اس طرح یورپ میں اس دن کوعید کی طرح مناتے ہیں۔اس دن برطانیہ میں بائیس ملین پاؤنڈ کے پھول فروخت ہوتے ہیں۔ اسی طرح چاکلیٹ بھی فروخت ہوتے ہیں۔بعض خلیجی ممالک میں تجارتی مراکز اورکمپنیاں اور ہوٹل 'عاشقوں کی عید' کے دن محفلیں سجاتے ہیں۔اکثر دوکانیں اورتجارتی مراکزتو سرخ لباس میں ڈُبادیے جاتے ہیں۔ہوٹلوں میں سرخ غبارے، کھیل اورگڑیاں پھیلائی جاتی ہیں۔اس جگہ بت پرستی کے قصے کیوپڈ جسے رومی قصوں میں محبت کا بت مانا جاتا ہے اس کو ڈراما یا جاتا ہے جوتقریباً بے لباس اوراس کے ہاتھ میں تیرکمان ہوتی ہے، اوراس ڈرامے میں فنکار حاضر ہونے والے لوگوں میں سے اس وصف کے ( مسز ویلنٹائن اورمسٹر ویلنٹائن ) کو چنتا ہے۔

مشرق میں ویلن ٹائن ڈے کا تصورنوے کی دہائی کے آخر میں ریڈیواورٹی وی کی خصوصی نشریات کی وجہ سے مقبول ہوا۔ شہری علاقوں میں اسے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔پھولوں کی فروخت میں کئی سوگنا اضافہ ہوجاتا ہے۔یہی حال کارڈز کی فروخت کا ہوتا ہے۔انسائیکلوپیڈیا آف بریٹینیکا کے مطابق اسے عاشقوں کے عید کے طور پر منایا جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بک آف نالج کے مطابق ویلن ٹائن ڈے جو 14 فروری کو منایا جاتا ہے محبوبوں کے لیے خاص دن ہے۔ بک آف نالج اس واقعہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ویلن ٹائن ڈے کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ اس کا آغاز ایک رومی عیدلوپرکالیا کی صورت میں ہوا۔قدیم رومی مرد اس عید کے موقع پر اپنی دوست لڑکیوں کے نام اپنی قمیصوں کی آستینوں پر لگا کر چلتے تھے۔بعض اوقات یہ جوڑے تحائف کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔بعد میں جب اس عیدکو سینٹ 'ویلن ٹائن' کے نام سے منایا جانے لگا تو اس کی بعض روایات کو برقرار رکھا گیا۔اسے ہراس فرد کے لئے اہم دن سمجھا جانے لگا جو رفیق یا رفیقہ حیات کی تلاش میں تھا۔

3۔ **ویلن ٹائن ڈے:** سینٹ ویلنٹائن نصرانی کنیسہ کا قدیم قربان ہونے والاشخص جوشہنشاہ کلاڈیس کی تعذیب کی تاب نہ لاتے ہوئے 296 میلادی میں ہلاک ہوگیا۔ اسی جگہ 350 میلادی میں بطوریادگارایک کنیسہ تیارکیا گیا۔جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو وہ سابقہ یوم عاشقہ کومناتے

رہے۔لیکن اسے بت پرستی کے مفہوم سے بدل کر محبت الٰہی کر لیا اور محبت کے شہداء میں بدل لیا۔ اپنے گمان کے مطابق محبت وسلامتی کی دعوت دینے والے سینٹ ویلنٹائن کے نام سے منسوب کر دیا۔اوراسے عاشقوں کی عید کا نام دیا۔ اورسینٹ ویلن ٹائن کو عاشقوں کا شفارشی اوران کا نگراں قبول کر لیا۔ان کے باطل اعتقادات اور رسم میں شامل تھا کہ نوجوان لڑکیوں کے نام کاغذ پر لکھ کر برتن میں ڈال کر اسے ٹیبل پر رکھ دیا جاتا۔اسے نکالنے لڑکوں کو کہا جاتا جس کا نام اس قرعہ میں نکل آتا وہ لڑکا اس لڑکی کی ایک برس تک خدمت کرتا اور وہ ایک دوسرے کے اخلاق کا تجربہ کرتے یا شادی کر لیتے یا آئندہ یوم عاشقہ کو پھر قرعہ نکالتے۔

اس رسم کی مخالفت دوسری قوموں کی طرح دین نصرانی کے عالموں نے بھی کی۔نوجوان لڑکے لڑکیوں کے اخلاق خراب کرنے کا سبب اٹلی میں ناجائز قرار دے دیا۔لیکن اس رسم کا فروغ اٹھارویں اورانیسویں صدی میں دوبارہ یورپی ممالک میں بک ڈپوؤں پر ویلن ٹائن کی کتاب کے نام سے فروخت سے ہوا۔جس میں عشق ومحبت کے اشعار ہوتے تھے۔ جسے عاشق اپنی محبوبہ کو لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس میں عشق ومحبت سے متعلق تجاویز ہوتی تھیں ۔اس کی ایک اور وجہ جب رومیوں نے نصرانیت قبول کی اورعیسائیت کے ظہور کے بعد اس میں داخل ہوئے تو تیسری صدی میلادی میں شہنشاہ کلاڈیس دوم نے اپنی فوج کے لوگوں پر شادی کرنے کی پابندی لگادی تھی۔ کیوں کہ سپاہی جنگوں میں نہیں جاتے تھے۔

سینٹ ولنٹائن نے اس فیصلہ کی مخالفت کی۔ وہ چوری سے فوجیوں کی شادیاں کرواتا رہا۔ جب کلاڈیس کو اس کا علم ہوا تو اس نے سینٹ ویلنٹائن کو سزائے موت دے دی۔ دوران قید سینٹ ویلنٹائن کو جیلر کی بیٹی سے محبت ہوگئی اور سب کچھ خفیہ ہوا کیوں کہ پادریوں اور راہبوں پر عیسائیوں کے ہاں شادی کرنا اور محبت کے تعلقات قائم کرنا حرام ہے۔ نصاری کے ہاں اس کی سفارش کی گئی کہ نصرانیت پر قائم رہو شہنشاہ نے اسے عیسائیت ترک کر کے رومی دین قبول کرنے کو کہا کہ اگر وہ عیسائیت ترک کر دے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ یہاں تک اسے اپنا داماد بنا کر اپنے مصاحبین میں شامل کرے گا۔لیکن ویلنٹائن نے انکار کر دیا اور عیسائیت کو ترجیح دی تو پندرہ فروری کی رات اسے پھانسی دے دی گئی ،تو اسے قدس یعنی پاکباز بشپ کا خطاب دیا گیا۔کتاب قص الحھار میں ہے:

کنیسہ نے ایک ڈائری ترتیب دے رکھی ہے جس میں ہر دن ایک مقدس اور پاکباز شخص کی عید مقرر کیا ہے ، اور انگلینڈ میں سینٹ ویلنٹائن کی عید کا دن موسم سرما کے آخر میں منایا جاتا تھا اور جب یہ دن آتا ہے تو ان کے کہنے کے مطابق جنگلوں میں پرندے بڑے گرم جوشی کے ساتھ آپس میں شادیاں کرتے ہیں،اور نوجوان اپنی محبوبہ لڑکیوں کے گھروں کی دہلیزوں پر سرخ گلاب کے پھول رکھتے ہیں۔قص الحھار تالیف ول ڈیورنٹ(15-23)۔

پوپ(عیسائیوں کے سردار اور بڑے عالم کی بات حکم کا درجہ رکھے اسے عیسائی پوپ کہتے ہیں) نے سینٹ ویلنٹائن کی یوم وفات کو یوم عاشقہ قرار دیا اور یہ دن منانے کا حکم دیا۔اس کے علاوہ 'ویلن ٹائن ڈے کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

کہ روایت کے مطابق تیسری صدی عیسوی کی سلطنت روم میں حکمران کلاڈئیس دوئم نے نوجوانی میں شادی کرنے پر پابندی عائد کردی تھی۔اس کے خیال میں شادی شدہ اور بچوں والوں کی نسبت غیر شادی شدہ مرد بہتر سپاہی اور جنگجو ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے نوجوانوں کو ایک مخصوص عمر سے پہلے شادی کرنے سے منع کردیا۔اس کے فرمان کے باوجود ایک عیسائی پادری سینٹ ویلنٹائن پیار کرنے والے جوڑوں کی شادیاں کرواتا رہا۔اس جرم میں کلاڈئیس نے اسے پھانسی کی سزادی۔ اسی پادری کی یاد میں ویلن ٹائن ڈے منایا جانے لگا۔

14 فروری کو سینٹ ویلن ٹائن سے منسوب کیوں کیا گیا؟ مستند حوالہ نہیں ہے۔البتہ ایک خیالی داستان ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں روم میں ویلن ٹائن نام کا پادری ایک راہبہ سے مباشرت کیا۔چوں کہ عیسائیت میں راہبوں اور راہبات کا نکاح ممنوع ہے۔کلیسا کی روایات کو قدغن لگانے پر اسے قتل کردیا گیا۔لیکن بعد میں اس کو شہید محبت کا مرتبہ دیا گیا اور اس کی یاد میں باقاعدہ یوم عاشقہ منانا شروع کردیا۔لیکن مذہبی رواداروں نے ان خرافات کی ہمیشہ مذمت کی اور اسے جنسی بے راہ روی کی تبلیغ پر مبنی قرار دیا۔

یوم عاشقہ کی ہر سال عیسائی پادری بھی مذمت کرتے ہیں۔یہ عید اب یومِ اوباشی کی صورت اختیار کرچکی ہے۔مغرب میں محبت کا تصور بوالہوس (Lust) ہے۔تہذیبی اہداف میں جنسی ہوس اور جنسی باؤلے پن کی تسکین کے آزادانہ اختلاط کو بھرپور ہوا دینا ہے۔اس معاشرے میں عشق اور فیق میں کوئی فرق روا نہیں ہے۔مرد وزن کی باہمی رضامندی سے ہر طرح شہوت رانی اور زناکاری وہاں 'محبت' ہی کہلاتی ہے۔اسی لئے ویلنٹائن جنسی بے راہ روی کے لئے بطور استعارہ بن گیا ہے۔

یوم عاشقہ سے متعلق بہت سی روایات ہیں۔اس دن ''سینٹ ویلنٹائن'' نے روزہ رکھا تو اُسے محبت کا دیوتا مان کر یہ دن اُسی کے نام منسوب کردیا گیا۔کئی لوگ اُسے ''کیوپڈ'' (محبت کے دیوتا) اور ''وینس'' (حسن کی دیوی) سے موسوم کرتے ہیں جو کیوپڈ کی ماں تھی۔یہ لوگ کیوپڈ کو ویلن ٹائن ڈے کا مرکزی کردار سمجھتے ہیں جو اپنی محبت کے زہر بجھے تیر سے دلوں کو گھائل کرتا تھا۔شواہد کے مطابق اس دن کے آغاز کے آثار قدیم رومن تہذیب کے عروج سے ہیں۔14 فروری کا دن رومن دیوی، دیوتاؤں کی ملکہ ''جونو'' کے اعزاز میں یوم تعطیل کے طور پر منایا جاتا تھا۔

اہلِ روم ملکہ جونو کو صنفِ نازک اور شادی کی دیوی سے موسوم کرتے ہیں۔15 فروری ''لیوپرکس'' دیوتا کا دن مشہور تھا اِس دن اہلِ روم جشنِ زرخیزی مناتے تھے۔اسی لیے یوم عاشقہ رومن بت پرستوں کی عیدوں میں سے ایک عید ہے۔ ان کے ہاں بت پرستی سترہ صدیوں سے ہے۔اس بت پرستی کی عید کے بارے میں کئی قسم کے قصے رومیوں اور ان کے وارث عیسائیوں کے ہاں معروف ہیں۔سب سے مقبول قصہ یہ ہے ''رومیوں کا عقیدہ تھا کہ روم شہر کے مؤسس رومولیوس کو ایک دن مادہ بھیڑیے نے دودھ پلایا جس کی وجہ سے اسے قوت فکری حلم وبردباری حاصل ہوئی''۔لہذا رومی قوم اس حادثہ کی وجہ سے ہر برس 14 فروری کو عید مناتے تھے۔اس میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ وہ کتا اور بکری ذبح کرتے، اور مضبوط اور گٹھے ہوئے

عضلات والے دونو جوان اپنے جسم پر کتے اور بکری کے خون کا لیپ کرتے اور پھر اس خون کو دودھ کے ساتھ دھوتے اور اس کے بعد ایک بہت بڑا قافلہ چلتا جس کے آگے وہ نوجوان ہوتے اور یہ قافلہ گلی کوچوں اور سڑکوں پر چلتا ، ان دونو جوانوں کے ہاتھ میں چمڑے کے دو ٹکڑے ہوتے جو بھی انہیں ملتا اسے وہ ٹکڑے مارتے ، اور رومی خواتین خوشی سے یہ مار برداشت کرتی تھیں۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ اس میں شفا ہے اور بانجھ پن ختم ہوجاتا ہے۔

جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو وہ اپنے اِس سابقہ عید یومِ محبت مناتے رہے لیکن انھوں نے اِسے بت پرستی کے مفہوم سے نکال کر محبتِ الٰہی میں تبدیل کرلیا اور دوسرے مفہوم کو محبت کے شہداء میں بدل لیا اور انھوں نے اِسے اپنے گمان کے مطابق محبت وسلامتی کی دعوت دینے والے سینٹ ویلنٹائن کے نام کردیا جسے اِس راستے میں شہید گردانتے ہیں اور اِسے عاشقوں کی عید اور عید کا نام دیا جاتا ہے اور سینٹ ویلنٹائن کو عاشقوں کا سفارشی اور اُن کا نگران شمار کرتے ہیں۔ اُن کے باطل اعتقادات اور اِس دن کی مشہور رسم یہ تھی کہ نوجوان اور شادی کی عمر میں پہنچنے والی لڑکیوں کے نام کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر ایک برتن میں ڈالے جاتے اور اُسے ٹیبل پر رکھ دیا جاتا اور شادی کی رغبت رکھنے والے نوجوان لڑکیوں کو دعوت دی جاتی کہ وہ اُس سے ایک ایک پرچی نکالیں، لہٰذا جس کا نام اُس قرعہ میں نکل آتا وہ لڑکا اُس لڑکی کی ایک برس تک خدمت کرتا اور وہ ایک دوسرے کے اخلاق کا تجربہ کرتے پھر بعد میں شادی کرلیتے یا پھر آئندہ برس اُسی عید یوم عاشقہ میں دوبارہ قرعہ نکالتے۔

نصاریٰ کے ہاں اِس کی سفارش کی گئی کہ نصرانیت پر قائم رہو۔ شہنشاہ نے اُسے عیسائیت ترک کرکے رومی دین قبول کرنے کو کہا۔ تب ہی معاف کیا جائے گا۔ اپنا داماد بنا کر مصاحبین کے ساتھ شامل کرے گا، لیکن ویلنٹائن نے نہ صرف سختی سے انکار کیا بلکہ عیسائیت کو ترجیح دی اور آخر تک اِسی پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا تو 14 اور 15 فروری 270 عیسوی کی رات اُسے پھانسی دے دی گئی تو اُس دن سے اُسے پاکباز بشپ کا خطاب دے دیا گیا۔ روایت کے مطابق اُس دن کی یاد میں محبت کرنے والوں کے درمیان پیار بھرے پیغامات کا تبادلہ ہوگیا۔ اِس روایت سے ہٹ کر ایک تاثر یہ ہے کہ عیسائی چرچ نے قدیم روم کے غیر عیسائی لپرکالیا فیسٹیول کے متبادل یومِ ویلنٹائن منانا شروع کیا۔

برطانیہ میں یومِ ویلن ٹائن کو مقبولیت سترہویں صدی عیسوی میں ملی۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک دوستوں اور محبت کرنے والوں کے درمیان اُس دن پیغامات کا تبادلہ عام ہوگیا۔ اِس صدی کے اختتام تک ویلن ٹائن ڈے کے کارڈز سامنے آگئے۔ اس وقت مرد و زن کے ایک دوسرے سے تعلقات یا دوستی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امریکیوں میں بھی ویلن ٹائن ڈے کے پیغامات کا تبادلہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوا۔ ویلن ٹائن ڈے پر مختلف طرز کے تحفے دینے کا رواج ہے۔ اِن تحائف میں پہلی بار جو تحفہ سامنے آیا وہ نقش ونگار والی پیپر لیس تھی جس کو امریکہ میں تیار کیا گیا تھا۔ اِس کے بعد برطانیہ میں ویلن ٹائن ڈے کارڈ کا رواج عام ہوا۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ کارڈ کرسمس پر اپنے

محبوب افراد کو تحفہ دیتے ہیں۔ امریکن گریٹنگ کارڈ ایسوسی ایشن کے مطابق یوم عاشقہ کو تقریباً ایک ارب کارڈ فروخت ہوتے ہیں ۔ جن میں 85 فیصد خواتین ویلنٹائن کی چیزیں خریدتی ہیں۔ 19 ویں صدی تک ہاتھ سے لکھے گئے خطوط کا چلن عام تھا۔ بعد میں گریٹنگ کارڈ کا رواج ہوا۔ اس طرح یہ دن جشن کے علاوہ بہت بڑا کاروبار بن گیا ہے۔ 20 ویں صدی میں مرد خواتین کو امریکہ میں کارڈز کے ساتھ مختلف تحائف میں سرخ گلاب کے پھول اور چاکلیٹ جن کو دل کی شکل کے ڈبوں میں رکھ کر سرخ رنگ کے ربن کے ساتھ سجا کر دینے کا رواج عام ہو گیا۔ اس دن ہیرے جواہرات کے بھی تحفے دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ کے بعض ایلی منٹری اسکولوں میں طلبہ سے اپنی جماعتوں کو سجانے کے لئے اور تمام ساتھیوں کو ایک دوسرے کو ویلنٹائن کارڈ یا تحفہ دینے کے لئے بھی کہا جاتا ہے۔ برطانیہ سے رواج پانے والی اس روایت کو زیادہ فروغ امریکہ اور جرمنی میں ہوا۔ جرمنی میں دوسری جنگِ عظیم تک یہ روایت نہیں تھی۔

برطانوی کاؤنٹی ویلز میں لکڑی کے چمچ 14 فروری کو تحفہ دینے کے لئے ان پر خوبصورت دل تراشتے اور چابیاں لگا کر بطور تحفہ دیتے تھے۔ یہ اِس بات کا اشارہ ہوتیں کہ تم ''میرے بند دل کو اپنی محبت کی چابی سے کھول سکتے ہو''۔ چند افراد کا یقین تھا کہ ویلن ٹائن ڈے کو اگر کوئی چڑیا کسی عورت کے اوپر سے گزر جائے تو اُس کی شادی ملاح سے ہوتی ہے، اگر عورت کوئی چڑیا دیکھ لے تو اُس کی شادی کسی غریب سے ہوگی اور زندگی خوشگوار ہوگی اور اگر عورت اس دن سنہرے پرندے کو دیکھ لے تو اُس کی شادی کسی امیر کبیر سے ہوگی اور زندگی ناخوشگوار گزرے گی۔ امریکہ میں اس دن شادی کی متمنی لڑکے لڑکیاں سٹیم ہاؤس جا کر ڈانس کریں اور ایک دوسرے کے نام دہرائیں۔ رقص ختم ہونے قبل جس کا نام لبوں پر ہوگا اُسی سے شادی قرار پائے گی۔

برطانیہ میں ویلن ٹائن ڈے کو علاقائی روایات مانا جاتا ہے۔ نورفولک میں گھروں کے پچھلے دروازوں پر بچوں کے لئے ٹافیاں اور تحالف چھوڑ جاتے ہیں۔ ویلز میں بہت سے لوگ اِس دن کے بدلے میں 25 جنوری کو سینٹ ڈائینونز ڈے مناتے ہیں۔ فرانس روایتی طور پر ہر ایک کیتھولک ملک ہے، یہاں ویلن ٹائن ڈے کو ''سینٹ ویلنٹین'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں یہ دن مغربی ممالک کی طرح ہی منایا جاتا ہے۔ اسپین میں یہی روایت ہے۔ ڈنمارک اور ناروے میں یہ روایت بہت کم ہے مگر کئی جوڑے رومانوی ڈنر پر جاتے ہیں اور تحائف دیتے ہیں۔ سویڈن میں پہلی بار 1960 میں اِس دن کو'' آل ہارٹس ڈے'' فلاور انڈسٹری نے کا نام دیا تھا۔ فن لینڈ میں اِس دن کو''فرینڈ ڈے'' کہا جاتا ہے۔ اس دن کو خاص دوستوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ سلوانیا اور رومانیا میں یہ دن عام مغربی ممالک کی طرح منایا جاتا ہے۔ اِس دن روایتی طور پر چھٹی ہوتی ہے۔

برازیل میں اکیس جون کو'' بوائے فرینڈ ڈے'' کے نام سے منایا جاتا ہے۔ اِس دن جوڑے آپس میں مختلف تحائف دیتے ہیں۔ جاپان ، چین، کوریا اور دوسرے ایشیائی ممالک میں بھی یہ دن روایت کے مطابق منایا جاتا ہے۔ خاص

کر جوڑے سرخ گلاب کو تحفے میں محبت کی نشانی سمجھ کر دیتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اِس دن کو بہت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔لیکن کئی تنظیمیں یہ دن منانے کے خلاف ہیں۔مشرق وسطیٰ کے ایران، سعودی عرب اور دوسرے کئی ممالک میں اِس دن کو منانے پر پابندی ہے۔ بالخصوص سعودی عرب میں ویلن ٹائن ڈے پر دیے جانے والے تحائف پر پابندی ہے۔

**4۔مفروضے:** مغربی ممالک میں ماڈرن ازم کے نام پر یوم عاشقہ منایا جاتا ہے۔اس دن اپنی محبوبہ کو تحفے دیے جاتے ہیں۔جس سے بے راہ روی، فحش کلچر اور بے حیائی عام ہوتی ہے۔اس عید کا تصور ایک زانی ویلنٹائن کے نام پر ہے۔اس دن اجنبی لڑکیوں سے بھی محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس کلچر سے خاندانی نظام متاثر ہورہا ہے' بالخصوص مشرقی تہذیب وتمدن بھی اس رسم میں مبتلا ہے۔اس عید سے دنیا بھر میں بے حیائی عام رہی ہے ، طبقہ نسواں کی حیثیت صرف جنسی تلذذ حاصل کرنے تک محدود ہورہی ہے۔ چوں کہ اس دن کا آغاز ہی غیر اخلاقی طور پر ہوا تھا۔ جب کہ اسلام میں شادی سے قبل محبت کا تصور ہی نہیں ہے۔اس غیر اخلاقی تصور کو عید کے نام پر صنف نازک کے لطیف جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور انہیں تذلیل کر کے اگلے اسی دن کسی دوسری لڑکی سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔اس طرح عورت کے فطری جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ مردوں کی طرح آزادانہ زندگی جینے پر مجبور ہوجاتی ہے۔اسی لیے آج مغربی ممالک میں خاندانی نظام ختم ہورہا ہے۔

5۔ **مقاصد:** ویلن ٹائن ڈے کا تاریخی جائزہ تانیثی نقطہ نظر سے لینا۔اس دن کیوں غیر اخلاقی روایت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ حقائق کی روشنی میں 'یوم عاشقہ' کی بنیادی وجوہات معلوم کرنا۔ کیا یہ رسم اخلاقی یا مذہبی اعتبار سے درست ہے؟ کیوں ایک زانی کے نام پر یہ دن منسوب کیا گیا ہے؟ کیا یوم عاشقہ منانے سے انسانیت کو فائدہ ہے؟ ایسے کئی سوالات ہیں جس سے آگہی حاصل کرنا ہے۔

6۔ **مشاہدات وتجاویز:** عاشقوں کی عید کا تصور اسلامی معاشرے نہیں ہے۔ اسی لیے ہمیں گہرائی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہمیں اپنی اسلامی اقدار سے دور تو نہیں کیا جارہا! سوچنا چاہیے کہ کیا غیر مسلمان عیدالفطر اور عید قرباں مناتے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نہیں ہوگا۔ پھر کیوں غیر اخلاقی عید مناتے ہیں۔ہم صرف اسلامی اقدار کو اپنائیں اور غیر اسلامی عیدوں کو بالکل رد کردیں۔ اگر ایسے اقدامات کی روک تھام نہ کی گئی تو آئندہ چند برسوں میں جنسی انارکی اور اباحیت کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب اس معاشرے کی رہی سہی اسلامی اقدار بہالے جائے گا۔ یوم عاشقہ منانے میں بت پرست رومیوں اور پھر اہل کتاب عیسائیوں کے ساتھ مشابہت ہے۔ انھوں نے رومیوں کی تقلید کی ہے۔ یہ عید اصلا رومی بت پرستوں کا عقیدہ ہے جسے وہ محبت کے الہ سے تعبیر کرتے ہیں۔لہذا جس نے بھی اس عید کو منایا وہ ایک شرکیہ عید منایا اور بتوں کی تعظیم کیا ہے۔ اسی لیے یہ عید منانا حرام ہے۔اس کا اعتراف دیگر مذاہب نے بھی کیا ہے جیسے کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں نے اس عید کو اٹلی میں پابندی لگا دی ہے۔ کیوں کہ اس میں گندے اخلاق کی اشاعت اور نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی عقلوں پر برا اثر پڑتا ہے۔

☆☆☆

محمد ابراہیم خلیل سبیلی
حافظ بابانگر، حیدرآباد

# طلباء کی نشو ونما میں استاد کا کردار

طلباء کی نشو ونما اور قوموں کی تعمیر و ترقی میں استاد کا رول سب سے اہم ہوتا ہے۔ ہر مذہب اور ہر سماج میں استاد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔لیکن اسلام نے استاد کو جو مقام و مرتبہ دیا ہے رسول اللہ کے اس قول سے اس کی قدر و منزلت معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا '' میں اس جہاں میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں'' حضرت عمر سے کسی نے ان کی عظیم خلافت کا حوالہ دے کر پوچھا اس کے بعد بھی آپ کی کوئی حسرت باقی رہ گئی ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا'' کاش میں ایک معلم ہوتا'' حضرت علیؓ فرماتے ہیں: '' جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھا دیا میں اس کا غلام ہوں، چاہے وہ مجھے اسی حالت میں رکھے یا آزاد کردے'' سکندر اعظم کا قول ہے'' والدین کے بعد اس دنیا میں سب سے زیادہ قابل احترام استاد ہے' کیونکہ والدین اولاد کو آسمان سے زمین پر لاتے ہیں۔ اور استاد اُن کو زمین سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچاتا ہے''۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اولاد کے سلسلہ میں والدین کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔لیکن استاد کا کردار بھی ان سے کچھ کم نہیں اور چلنے پھرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔لیکن استاد وہ عظیم رہنما ہے جو ان کو آدمی سے انسان بناتا ہے، اور ان کو اخلاق و کردار، علم و لیاقت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔کسی محقق کا قول ہے، استاد گرچہ کہ بادشاہ نہیں ہوتا، لیکن وہ بادشاہ پیدا کرتا ہے۔اگر آج ہم بقراط، ارسطو، افلاطون اور جبران وغیرہ کو پڑھتے ہیں اور ان کے تبحرِ علمی پر اپنا سر دُھنتے ہیں تو یہ بھی ضرور ہے کہ انہوں نے بھی کسی نہ کسی استاد سے حروف تہجی ضرور سیکھا ہوگا۔

آج ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے، جس میں اسکولس، کالجس اور یونیورسٹیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ایک طرف طلباء کیلئے کتابوں کا انبار ہے تو دوسری طرف جدید آلات کے ذریعہ تعلیمی وسائل کی بھرمار۔اس کے باوجود ہمارے اکثر طلباء تعلیمی و تخلیقی صلاحیتوں اور فنی مہارتوں سے یکسر محروم نظر آتے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟ اس میں آیا کمی طلباء کی ہے یا اساتذہ کی؟ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اساتذہ بھی برابر کے قصوروار ہیں' کیونکہ آج کل اساتذہ صرف نصابی کتب

کے پابند ہوتے جارہے ہیں۔انہیں متعلقات نصاب سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ یا یوں کہ لیں کہ وہ نصابی متعلقات کا مطالعہ کرتے ہی نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اچھے اساتذہ صرف نصابی کتابوں پر اعتماد نہیں کرتے' بلکہ وہ اپنی تخلیقی اور مطالعاتی صلاحیتوں کے ذریعہ طلباء میں نصابی کتب کے علاوہ بہت ساری مہارتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ اچھے استاد کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے درس میں تمام بچوں کو شامل کرتا ہے۔ نئے نئے مضامین اور مختلف سوالات و جوابات کے ذریعہ ان کی دلچسپی بڑھاتا ہے۔ نصابی کتاب کے ایک سبق کو لے کر اس کے متعلقات اور ہمہ گیر جہات پر روشنی ڈالتا ہے۔اس کی نظر صرف نمبرات پر نہیں ہوتی بلکہ طالب علم کی مکمل شخصیت اور اس کی نشوونما پر ہوتی ہے۔صرف سوالات کے جوابات حل کرادینا، خالی جگہوں کو پر کرادینا اور تمام نصاب کو ایک طوطے کی طرح رٹا دینا اچھے استاد کی پہچان نہیں ہوتی۔جو اساتذہ ایسا کرتے ہیں،اور طے شدہ نصاب ہی پر انحصار کرتے ہیں وہ طلباء میں کبھی مقبولیت حاصل نہیں کرسکتے۔اور جب کبھی ایسے اساتذہ کمرہ جماعت میں آتے ہیں تو طلباء ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں،اوران کے اوقات تدریس میں یا تو سو رہے ہوتے ہیں یا کوئی بہانہ بنا کر کمرہ جماعت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حصول تعلیم کے کئی ذرائع ہیں۔لیکن ان میں چار ذرائع بہت اہم معلوم ہوتے ہیں۔سننا، بولنا، پڑھنا، لکھنا۔ بولنے کا تعلق سننے سے اور لکھنے کا تعلق پڑھنے سے ہے۔ ایک طالب علم اسی وقت اچھا لکھ سکتا اور اچھا بول سکتا ہے جب وہ اچھا پڑھے اور اچھا سنے۔اور یہ خوبیاں طالب علم میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب استاد کی طرف سے اچھا بولنے اور اچھا پڑھانے کا عمل بخوبی ہو رہا ہو۔لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ٹیچرس کی تمام تر محنتیں صرف لکھانے پہ مرکوز ہوتی ہیں۔ ہر کام کیلئے یہاں کاپیاں اور ورک بکس الگ الگ ہوتے ہیں اور یہ سارے ہی سفید سے سیاہ ہوجاتے ہیں۔ بچہ جیسے کو تیسا لکھ تو لیتا ہے،لیکن نہ پڑھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ایک ماہر استاد کا کام صرف سفید اوراق کو سیاہ کروانا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تلفظ کی صحیح ادائیگی، عبارت خوانی، مضمون دانی اور رموز واوقاف کی رعایت جیسی اہم چیزوں کو اپنے درس میں شامل کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اسکولس میں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ کے جی سے لے کر پرائمری سطح تک کی باگ دوڑ بالکل غیر تعلیم یافتہ ٹیچرس کے ہاتھ میں تھمادی گئی ہے۔حالانکہ بنیادی طور پر پل بڑھنے اور ذہن سازی کی عمر یہی ہوتی ہے۔اس عمر میں بچوں کا ذہن کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے، جو چیز اس پر لکھ دی جائے وہ محفوظ ہوجاتی ہے۔ٹیچر کو معلوم ہونا چاہئے کہ چھوٹی جماعت کے طلباء کی دنیا سب سے الگ ہوتی ہے۔ یہ طلبا وہ نہیں پڑھتے جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے بلکہ وہ پڑھنا چاہتے ہیں جو ان کا ذہن کہتا ہے۔ اس لئے استاد کو بھی چاہئے کہ بچوں کو ایسے ذرائع سے تعلیم دیں جس کو ان کا

ذہن آسانی سے قبول کرلے اوران کے ذہن کی نشونما اور ان کی نصابی تعلیم کے مابین کوئی چیز حائل نہ ہو۔ پرائمری سطح پر یہ بات بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ ٹیچرس کی نگاہ تعلیم و تربیت اوراخلاق وکردار کے بالمقابل مارکس شیٹ پر زیادہ ہوتی ہے۔اس میں یا تو سرپرست حضرات کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے یا طالب علم کی بے جا ترغیب۔ جو کچھ بھی ہولیکن یہ ایک اچھے استاد کی پہچان نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کے شاگرد رشید حضرت امام ابو یوسف نے پوچھا کہ استاد کو کیسا ہونا چاہئے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ ''اگر وہ ایسے پڑھا رہا ہو جیسے کوئی باپ اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے تو وہ استاد ہے اوراگر دوسروں کے بچے سمجھ کر پڑھا رہا ہوتو وہ استاد نہیں ہے۔'' امام صاحب کے قول کی روشنی میں اگر اساتذہ کو دیکھا جائے تو استاد اور شاگرد کا یہ مقدس رشتہ ہمیں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مادیت پرستی کے اس دور میں پیشہ تدریس صرف ایک نوکری اور ایک جاب کی حد تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ استاد کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ صرف کمرہ جماعت یا اسکول کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر جگہ اور ہر پل اپنے کردار و گفتار میں استاد ہوتا ہے۔طلباء استاد سے صرف اسباق یا کتاب نہیں پڑھتے بلکہ اس کی زندگی اور اس کی شخصیت کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ایک عظیم استاد اپنی ذات کو نہ صرف نکھارتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کے ذریعہ معاشرہ کو اچھے انسان بھی فراہم کرتا ہے۔

اس کے علاوہ آج کل تعلیمی ادارے بھی اپنی اصل غرض و غایت سے ہٹتے جارہے ہیں۔ یہ ادارے ڈاکٹرس، انجنیئرس، سائنسدان اور سیاست دان بنانے میں تو اپنا رول ادا کررہے ہیں لیکن انسان سازی میں ناکام نظر آتے ہیں۔ایسے وقت میں اساتذہ کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ طلباء میں مادہ پرستی کی جگہ ایمان ویقین اور ایسے اخلاق وکردار کو فروغ دیں جس سے طالب علم میں منفی رجحان کے بجائے مثبت رجحان پیدا ہوجائے۔اورفراغت کے بعد وہ اپنی تعلیمی اسناد کو صرف ذریعہ معاش بنانے کے بجائے خدمت خلق کے طور پر بھی استعمال کریں۔ کیونکہ تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش نہیں ہے۔

☆☆☆

## خود کی قدر کریں۔ دھوکا مت کھائیں

بعض دفعہ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ سامنے والا ہمیں دھوکا دے رہا ہے' ہم پھر بھی خاموش رہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم اس کے دھوکے کے ساتھ تو جی سکتے ہیں پر اس کے بنا نہیں' مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ زندگی میں کبھی بھی کسی کی ہمدردی میں اپنی ذات کو اِگنور نہ کریں' کیوں کہ اس کے لئے آپ ایک آپشن کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔ جب آپ ٹوٹ کے بکھروگے تو خود کو تنہا پاؤگے' جس کو جوڑتے جوڑتے آپ خود ٹوٹ جاتے ہو۔اسے آپ کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنے اصل کی جانب لوٹ جاتا ہے' اس لئے خود کی قدر کریں ورنہ لوگ آپ کو مٹی میں ملانے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگائیں گے۔ ہمیشہ سوچ کر فیصلے کیجئے۔

☆☆☆

حشمت کمال پاشا
بی ۔119‘نواب واجدعلی شاہ روڈ
پوسٹ:۔گارڈن ریچ کولکاتا ۔۷۰۰۰۲۴

# غالبؔ بچوں کی محفل میں

اس وقت میرے سامنے غالب کا رسالہ ’’قادرنامہ‘‘ ہے جس کے بارے میں مالک رام فرماتے ہیں ’’مرزا نے عارف کے دونوں بچوں باقر علی اور حسین علی خان کی تعلیم کے لئے یہ رسالہ تصنیف کیا تھا‘‘ (ذکر غالب صفحہ ۹۸) قادرنامہ میں گرچہ بچوں کی دوغزلیں بھی ہیں ۔لیکن یہ قادرنامہ ۱۲۱/اشعار پر مشتمل ایک منظوم لغت ہے جو بچوں کی ذہنی کیفیات کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔اس میں ۳۳/عربی و فارسی الفاظ کے ہندوی مترادفات و معنیٰ نظم میں بیان کئے گئے ہیں جو بہت ہی سادہ اور عام فہم ہے۔ منظوم لغات کا یہ طریقہ بہت ہی پرانا ہے ۔عربی میں فن لغت کی سب سے پرانی کتاب ابوالعلی محمد فطرالسخوی کی ’’مثلثات یہ قطرب‘‘ ہے جس میں ۳۲/اشعار میں ۳۰/ الفاظ کے معنیٰ بیان کئے گئے ہیں ۔ابوالفراسماعیل بن حماد الجوہری کی ’’صحاح‘‘ فن لغت میں کلاسیکل کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ فارسی میں ابوالفرفرائی نے ۶۵ھ (۱۲۱۳ء) میں نصاب الصبیان لکھی جو درس نظامیہ میں صدیوں سے داخل ہے جس میں عربی لغات کو فارسی اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔امیرخسرو نے بھی اس روایت کی پیروی میں خالق باری تصنیف کی جس کے مطالعہ سے اُردولفظوں کی قدامت اوران کے رواج کی داستان سامنے آتی ہے۔ خالق باری کا پہلاشعر ہے:

خالق باری سرجن ہار
واحدایک بڑا کرتار

مطبوعہ الصبیان کے موئف ’’صفی‘‘ نے لکھا ہے کہ اصل ’’خالق باری‘‘ میں ۱۷۰/اشعار تھے اس کے بعد اس میں ۱۲۰/الحاقی اشعارشامل کئے گئے اور پھران میں اضافہ ہوا۔’’خالق باری‘‘ کی پیروی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں ۔جن میں اشرف بیابانی کی ’’واحد باری‘‘ اجے چند کی ’’مثل خالق باری‘‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غالب نے بھی اس کی پیروی میں ’’قادرنامہ‘‘ تصنیف کیا۔ (تاریخ ادب اردوجلد اول۔ڈاکٹر جمیل جالبی رصفحہ ۲۹ تا ۳۳)

مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کا سیکھنا زیادہ کٹھن ہوتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ منظوم لغت کا یہ طریقہ قدیم طرزتعلیم میں بہت مقبول ہوا کیونکہ بچے اسے آسانی

سے یاد کرلیا کرتے اور اچھے خاصے الفاظ کا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہوجاتا تھا۔مزید یہ کہ ان کے ذہن پر نہ تو کوئی بوجھ پڑتا تھا اور نہ طبیعت ہی بوجھل ہوتی تھی آج بھی دوسری زبانوں کے سیکھنے والے بچوں کے لئے یہ طریقہ مجرد اور سودمند ہے۔عربی مدارس جہاں زیادہ تر درس نظامیہ کا نصاب رائج ہے یہ طریقہ بہت مقبول ہے۔

اُردو ادب میں ادب الاطفال کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بہت کم لوگوں نے اپنی توجہ بچوں کے ادب کی طرف مبذول کی۔نظیر اکبرآبادی وہ پہلے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے بچوں کے ادب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔نظیر اکبرآبادی کے بعد غالب ہی کی وہ واحد شخصیت ہے جس نے اپنی توجہ بچوں کے ادب کی طرف مبذول کی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے ''قادرنامہ'' لکھا جو عام فہم اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری محاسن سے بھی بھرپور ہے۔غالب کے ایک چہیتے شاگرد مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے اس کو مزید آگے بڑھایا اور بچوں کے ادب میں جو خلا تھا اسے بہت حد تک پُر کیا۔

سینٹبری نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ''کیٹس نے ٹینی سن کو پیدا کیا اور ٹینی سن باقی تمام شعراء کو''۔ہم بھی ادب الاطفال کے سلسلے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کو پیدا کیا اور محمد اسمٰعیل میرٹھی نے ان تمام شعرا کو جو ادب الاطفال کی طرف مائل ہوئے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ بچوں کی شاعری بہت کٹھن ہے اس لئے بذات خود شاعر کو بچہ بننا پڑتا ہے کیونکہ بچوں کی زبان اپنی نوعیت کی منفرد زبان ہوتی ہے۔یہ عام فہم اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر حلاوت اور چٹخارہ بھی رکھتی ہے۔غالبؔ ذیل کے شعروں کو بچوں کی جانی پہچانی چیزوں کے الفاظ اور معنی خوبصورتی سے بتا گئے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:۔

سینہ۔چھاتی' دست۔ہاتھ اور پائے۔پاؤں
شاخ۔ٹہنی' برگ۔پتہ' سایہ۔چھاؤں
گربہ۔بلی' موش۔چوہا' دام۔جال
رشتہ۔تاگا' جامہ۔کپڑا' قحط۔کال
ماہ۔چاند' اختر ہیں تارے' رات۔شب
دانت۔دندان۔ ہونٹھ کو کہتے ہیں لب

مندرجہ بالا اشعار میں صرف الفاظ کے معنی بتائے گئے ہیں مگر حسب شعر میں لفظی معنی کے ساتھ ساتھ تعلیم دینے کی تکنیک بھی بالکل جدید ہے۔

چاہئے ہے ماں کو مادر جاننا
اور بھائی کو برادر جاننا
نعل اور آتش اسی کا نام ہے
جو کہ بے چین اور بے آرام ہے

ooo

غالبؔ بچوں کو علم صحیح قدر و قیمت بتاتے ہیں اور جاہلیت لعنت سے دور رہنے کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

علم ہی سے قدر ہے انسان کی
ہے وہی انسان جو جاہل نہیں

ooo

ساتھ ہی ساتھ اپنے دوسرے شعر میں کمزور طالب علموں کو تیز اور ذہین بننے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

کس طرح پڑھتے ہو رک رک کر سبق
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

ooo

غالبؔ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان بری عادتوں کو بھی واضح کیا ہے۔جس کی وجہ سے ننھا ذہن بگڑ جاتا ہے اور انہوں نے ایک ماہر نفسیات کی طرح بچوں کے کومل ذہن کو ڈر، خوف اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کا موثر طریقہ اختیار کیا:

ہے ہرا سیدن بھی ڈرنا کیوں ڈروں
اور جنگے دن ہے لڑنا کیوں لڑوں
ہے لڑائی حرب اور جنگ ایک چیز
جو برا ہے اس کو ہم کہتے ہیں زشت

ooo

پڑھائی لکھائی سے ذہنی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لئے غالب نے بچوں کو غزل کی جانب مائل کیا ہے۔ اس کے لئے آسان اور ہلکے پھلکے الفاظ میں ظرافت کے رنگ میں غزل پیش کی ہے تاکہ بیکار کھیل کود میں وقت ضائع نہ کر کے ادب سے دل بہلائیں۔

فرماتے ہیں:

ہاں غزل پڑھئے سبق گر یاد ہو

اور غزل پیش کرتے ہیں:۔

وہ چراوے باغ میں میوے جسے
پھاند جانا یاد ہے دیوار کا
لال ڈگری پر کرے گا جا کے کیا
پُل پہ چل ہے آج دن اتوار کا
گر نہ ڈرجاؤ تو دکھلاؤں تمہیں
کاٹ اپنی کھاٹ کی تلوار کا
واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

ooo

اور دوسری غزل کا حسب ذیل شعر جیسے پڑھ کر بچے محفوظ ہوں وہ بھی دیکھئے:

کیا کہیں کھائی حافظ جی کی مار
آج ہنستے آپ جو کِھل کِھل نہیں

ooo

''آج کے بچے کل کے معیار ہیں'' شاید اس مقولے کی روشنی میں غالب بچوں کے کھیل کود کا وقت ختم ہوجانے کے بعد ایک الارم کی طرح آواز دے کر بچوں کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اے بچو! جلدی جلدی چلے آؤ کہ تمہاری لکھائی پڑھائی کا وقت شروع ہو رہا ہے اور کھیل کا وقت ختم ہو چکا ہے۔'' چونکہ بچے اس وقت تازہ دم ہوتے ہیں اس لئے مندرجہ ذیل مصرعہ سن کر انہیں نصیحت ملتی ہے۔

لو سنو کل کا سبق آجاؤ تم

غرض کہ غالب چائلڈ سائکلو جی کے مطابق بچوں کو مختلف طریقوں سے تعلیم دینے کے حامی نظر آتے ہیں کیونکہ غالب کے خیال کے مطابق بچے بے جا سختی اور مار پیٹ سے نہیں پڑھتے بلکہ ان کو پیار محبت سے ہی پڑھایا جاسکتا ہے۔ غالب کے مطابق ''احوال غالب'' کے حوالے سے عارف کی بہو کی زبان سے ایک ایسا ہی واقعہ نقل کرتے ہیں۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حسن علی خاں، مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے، پڑھائی کے معاملے میں ان کی بہت زیادہ ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ارے حسن علی خاں آکر پڑھ لے۔ انہوں نے جواب دیا دادا جان آتا ہوں اور دوسری طرف نکل گئے''۔

مندرجہ بالا حوالے کے بعد اب یہ شعر دیکھئے:۔

زیستن کو جان من جینا کہو
اور نوشیدن کو تم پینا کہو

جہاں غالب نے بڑوں کے ادب میں اپنی حیثیت سب سے جداگانہ ومنفرد رکھی، وہیں بچوں کی شاعری میں غالب نے اپنی حیثیت منوانے کے ساتھ بچے کے نام خط لکھ کر بچوں کی نثر نگاری میں بھی ایک انوکھے انداز کی بنیاد ڈالی ہے جو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد شیکسپر کے ڈرامے کی طرح تازہ و دلکش ہے۔ غالب نے وہ مزیدار خط اپنے شاگرد نواب علاؤالدین احمد کے صاحبزادے نواب امیرالدین احمد خان کے نام ایک رقعہ کے جواب میں لکھا تھا۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

''ایں مردم چشم جہاں بین غالب، پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشم جہاں میں تمہارا باپ مرزا علاؤالدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا، مجھ کو بہت پسند آیا۔ استاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفریں صد آفریں۔ میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العالمین ہے کہ یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم وفضل اور تمہارے پردادا حضرت فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرام گاہ کے برابر جاہ وجلال عنایت کرے۔ میاں تمہارے دادا امین الدین احمد خان بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں، خبردار! ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو'' (خطوط نمبر ۴۶۱)

دیدار کا طالب
غالبؔ

الغرض غالبؔ کی کوئی بات لطف سے خالی نہ تھی۔

**بقول رام بابو سکسینہ:**

''ان کے مزاج کی افتادہ طبیعت میں واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اسے درجہ کمال تک پہونچا دیا۔

نمبر ۸۱، اردو معلیٰ خطوط نمبر ۴۶۱
طبع: اُردو گائڈ پریس کلکتہ ۱۸۸۳ء

☆☆☆

اقبال مجید اللہ
69 یوسف کالونی،
پربھنی 431401 مہاراشٹر

# دعوت نامہ کا ایک انداز یوں بھی

ہمارے یہاں سماج کے سب ہی طبقوں میں شادی بیاہ اور دیگر تقاریب کے موقع پر اُن کی جانب سے عزیز و اقارب واحباب کو اُس میں شرکت کے لئے دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں۔ مہمانوں کو عزت و توقیر کے ساتھ مدعو کرنے کا یہ رواج کافی قدیم ہے۔ ان دعوت ناموں میں اس تقریب کے بارے میں تفصیلات تحریر کی جاتی ہیں اور ایک لفافے میں رکھ کر روانہ کئے جاتے ہیں۔ پہلے یہ عام طور پر ایک ہی طرح کی تحریر ہوا کرتی تھی اس میں صرف نام اور تاریخ میں ہی تبدیلی کی جاتی تھیں مگر اب ان ہی دعوت ناموں میں واضح طور پر تغیر آچکا ہے۔ یہ دعوت نامے سیدھے سادھے نہ ہو کر اب خوبصورت، دیدزیب، اعلیٰ قسم کے کارڈس پر بہترین طباعت اور مختلف رنگوں سے دیدہ زیب خوبصورت مزین لفافوں میں آراستہ ہو کر منتظرین کے ذوق اُن کے وقار اور سماجی حیثیت کی بھی مکمل ترجمانی کرنے لگے ہیں۔

دعوت ناموں کا یہ انداز تو ہر شہر میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑی حد تک یکساں دکھائی دیتا ہے مگر ہمارے شہر میں دعوت ناموں کی یہہ تحریر ایک بالکل علیحدہ شکل میں سامنے آئی ہے بلکہ یہہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کے ہمارے شہر میں ایک طرح سے دعوت ناموں کی ایک نئی تاریخ رقم کی جارہی ہے اور اِن دعوت ناموں کے ساتھ ہمارے شہر کو بھی یاد رکھا جائے گا۔ دعوت ناموں کی اس دنیا جو خاموشی سے انقلاب ہمارے یہاں رونما ہوا ہے اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ہم تھوڑی سی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ ہمارے پڑھنے والوں کو آسانی رہے۔ ہمارے شہر میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود ہے جسے بلاشبہ اُسے ایک افسانوی کردار ہی تصور کیا جاسکتا ہے ان سے دیرینہ مراسم ہونے کی وجہ سے ہم نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بظاہر آنے والی شخصیت اپنے اندر کئی پہلو لیے ہوئے ہے۔ رسمی طور پر ہم آپ کو بتلا دیں کہ اُن کے والدین نے اُن کی شناخت کے لئے ایک نام ضرور رکھا ہوگا مگر اُن کے احباب نے اُن کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں رفیق محترم کا نام دے رکھا ہے' ہمارے شہر تمام لوگ اسی نام سے واقف ہیں۔ رفیق محترم سے اپنی پہلی ملاقات میں آپ اُن کی گفتگو کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اُن سے مل کر آپ کا تجسّس بڑھ جائے گا اور اُن سے دوبارہ ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوگی تا کہ اس شخصیت سے اپنے تعلقات کو

مزید دراز کیا جائے اور وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہیں جو ہمارے شہر پر چھا گئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے رفیق محترم اپنی گفتگو میں خواہ وہ عام بات چیت ہو یا پھر کسی خاص موضوع پر ہو وہ اُردو کے ثقیل اور فارسی و عربی آمیز الفاظ کے استعمال سے اپنے سُننے والوں کو اس حد تک مسحور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی گفتگو کو مکمل ہونے کے بعد ہی وہ سامع کافی دیر کے بعد اس سحر سے باہر نکل پاتے ہیں اور وہ سمجھ نہیں پاتے کہ وہ کونسے الفاظ جو اُن کی قوتِ سماعت سے ٹکرائے جن کے زیر اثر وہ کچھ دیر کے لئے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔

بہرحال بات کچھ بھی ہو یہ ایک حقیت ہے کہ عام الفاظ کا استعمال اُن کے سُننے والوں کو افہام وتفہیم کے عمل سے گذرے بغیر سمجھنا از حد دشوار ہے۔ جب کبھی ہم اُن سے کہتے ہیں کہ آپ ان مشکل الفاظ کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کے بجائے عام فہم اور سہل الفاظ کو اپنائیں تا کہ ہمیں کچھ راحت مل جائے ہم انہیں اپنی بات سمجھانے کے لئے یہ تاویل بھی اُردو کے حسن اور اُس کی خوبصورتی عام فہم الفاظ میں ہی ہے نا کہ ایسے الفاظ میں جو ذہن پر مقدور بھر بوجھل ثابت ہوں۔ اُنھوں نے ہماری اس دلیل کو بغور سنا اور نہایت فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئے کہ آسان وسہل الفاظ کے استعمال ہی نے اُردو کے وقار کو مجروح کر دیا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ کیا آپ نے فلم مغل اعظم کے مکالموں کے جاہ وجلال کو نہیں دیکھا۔ ذرا آپ تصور کیجئے کہ ان مکالموں کو نہایت سہل الفاظ میں ادا کئے جاتے تو کیا وہ جان پیدا ہوسکتی تھی پچاس برس کے بعد بھی آج انہیں کون یاد رکھتا تھا۔ان الفاظ کا جادو ہی تھا جو آج تک ہمارے ذہن میں نقش ہوکر رہ گیا ہے بھلا ہم اُن سے کیا بحث کرتے بہتر یہی سمجھا کہ اُن کے اس استدلال کو تسلیم کرلیا جائے۔

کبھی کبھی کچھ موقعوں پر ادق اور بھاری بھر کم کا استعمال مناسب بھی لگتا ہے مگر عام بات چیت میں یہہ ادق الفاظ ایک عجیب صورتحال سے بھی دوچار کر دیتے ہیں۔ ایک ایسے ہی موقع پر رفیق محترم کی بات چیت ایک صاحب خانہ کو الجھن میں مبتلا کر دیا۔ ہوا یوں کہ موسم گرما کی ایک دوپہر میں ہمارے ایک دوست سے ملنے کے لئے اُن کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے بات چیت کے دوران انہوں نے اپنے دوست کے لڑکے سے جو اُن کی طرز گفتگو کو نہایت دلچسپی سے سن رہا تھا کہا میاں صاحبزادے ذرا آبِ مقعطر لے آیئے۔ اُن کے دوست اُس فرمائش پر پس و پیش میں پڑ گئے قدرے پریشان ہوکر انہوں نے ہمارے رفیق محترم سے نہایت انکساری سے کہا ہم لوگ یونانی ادویات کا کم ہی استعمال کرتے ہیں بلکہ اِن دنوں اُن کی جگہ ایلو پیتھک نے لی ہے اور اس لئے ہم معذرت چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی فرمائش کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس بات کو سن کر ہمارے رفیق محترم نے ہنس کر کہا میں دراصل آپ سے ایک گلاس صاف ستھرے پانی کا مطالبہ کررہا تھا جسے میں نے آب بہ معنی پانی اور مقعطر صاف وشفاف کے لئے استعمال کیا ہے اور آپ اتنی سی بات پر الجھن میں پڑ گئے ہمارے دوست نے اُن سے دست بستہ کہا کہ ہم آسان الفاظ میں بات چیت کرنے کے عادی ہیں اور آپ کا یہ انداز تکلم اسے ہم سمجھ نہیں پائے۔

ہم پہلے ہی بتا چکتے ہیں کہ سہل و عام فہم الفاظ کے

بجائے ادق ترین الفاظ کا استعمال ہمارے رفیق محترم کو مضحکہ خیز حالات سے بھی دوچار کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دفعہ وہ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں سفر کر رہے تھے اور بس میں کافی بھیڑ ہونے کی وجہ کئی عورتیں مرد کھڑے ہو کر سفر کر رہے تھے بس میں نشست نہ ملنے کی وجہ سے رفیق محترم بھی بس کے ڈنڈے کو تھامے سفر کا مزہ لے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کا بازو ایک دیہاتی خاتون اُس ڈنڈے کے سہارے کھڑی ہچکولے کھا رہی تھی ۔ایسے وقت گذاری کے لئے ہمارے رفیق محترم کو کیا سوجھی کہ انہوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں اُس خاتون سے پوچھا۔ محترمہ آپ کی منزل مقصود سے فدوی کو آگاہ فرمائیں گی وہ خاتون اس قسم کی زبان لب و لہجہ نہیں جانتی تھی' اُس نے سمجھا یہ شخص اُسے الگ ہی انداز سے گفتگو کر رہا ہے بس اتنا سُنا تھا کہ وہ مراٹھی زبان میں گالی گلوج شروع ہوگئی جیسے تمہارے گھر ماں، بہن، بیوی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اچھا ہوا کہ بات زیادہ نہیں بڑھی چونکہ اُن کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب ہمارے رفیق محترم کی زبان دانی سے واقف تھے اُنہوں نے اُس خاتون کو مراٹھی میں کہا کہ وہ صرف یہ پوچھ رہے ہیں کہ تم کہاں جا رہی ہو۔ یہ بات سن کر وہ شرمندہ ہوئی اور وہ صاحب ہمارے رفیق محترم سے کہنے لگے کہ آپ کی زبان دانی سے انکار نہیں مگر موقع محل دیکھ کر الفاظ کا استعمال بھی کرنا چاہیے۔

ہمارے رفیق محترم کا اندازِ تخاطب اور بے حد ادق الفاظ کے استعمال کی ادنیٰ مثال آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ بات صرف بات چیت کی حد تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ انداز شدت کے ساتھ اُن کی تحریر میں بھی نمایاں ہے۔ ہمارے رفیق محترم صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہیں' ہمارے شہر کے ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اپنے اخبار میں وہ اپنی تحریر کے جو جوہر دکھاتے ہیں وہ پڑھنے والوں کے لئے ایک قیامت سے کم نہیں ہے۔ اس اخبار کو لغت جو فیروز اللغات سے اونچے درجہ کی ہو اُسے رجوع کئے بغیر سمجھنا ممکن نہیں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار کو پڑھنا ایک آزمائش سے گزرنا ہے۔ ہم اس اخبار کے قارئین کو صرف اتنا ضروری مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ موسم گرما میں جب درجہ حرارت ۴۰ ڈگری سے تجاوز کر جائے اس اخبار کو پڑھنے سے احتیاط کریں کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ اس موسم میں زیادہ غور کرنے کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھنے کے امکانات زیادہ رہتے ہیں۔ اس اخبار کے بیشتر قارئین کرام اپنے قریبی احباب کو اسے بطور تبرک دیا کرتے ہیں اس درخواست کے ساتھ کہ آپ اس کو سمجھنے کی اور پھر ہمیں سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کریں جس کے ہم دل کی گہرائیوں سے مشکور رہیں گے۔

ابھی تک آپ رفیق محترم کے انداز مخاطب، ثقیل اور غیر مستعمل لفظوں کا بے دردی سے استعمال اور انوکھا طرزِ تحریر ان باتوں سے ابھی ہم سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ رفیق محترم نے دعوت نامے اور رقعہ جات شکل میں ایک نئی قیامت سے دوچار کر دیا۔ اس کی تفصیلات کچھ یوں کہ ہمارے رفیق محترم زیادہ ہی غور و فکر کرنے کی عادی ہیں۔ اور اسی کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے سونچا عام طور پر شادی و بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر جو دعوت نامے اور رقعہ جات عزیز

واقارب اور احباب کوشرکت کے لئے روانہ کئے جاتے ہیں اور اُن پر جوعبارت تحریر ہوتی ے ونہایت از کاررفتہ اور کسی پرانی داستان کا ایک حصّہ معلوم ہوتی ہیں۔اور اس طرح سے دعوت نامے پڑھتے ہوئے اور شرکت کرتے ہوئے لوگ بڑی حدتک اُکتا سا گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سونچا اس میں کچھ نیا انداز اپنایا جائے اور اسی جدت کے طور پر جو دعوت نامے لکھے ہیں وہ اللہ کی پناہ۔اس بات کو آپ خود تصور کر سکتے ہیں کہ وہ شخص جو اپنے عام بات چیت میں جن الفاظ کا استعمال برملا کرتے ہیں اور جس کی ادنیٰ مثال آپ دیکھ چکے ہیں بھلا وہ شخصیت ان دعوت ناموں میں کیا طوفان برپا کرے گا اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان دعوت ناموں کے ملنے کے بعد عزیز واقارب اور خاص طور پر عمر رسیدہ احباب یہی دُعا کرتے ہوئے نظر آئے کہ اے پروردگار جس طرح تونے ہمیں اس تقریب میں شرکت کرنے کی عزت بخشی ہے اُس کے دعوت نامے کی تحریر کو سمجھنے کی توفیق بھی عطا کر اور یہہ مرحلہ ہمیں آسان فرما۔اس دعوت نامے میں کیسے کیسے نامانوس الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔وہ رقعوں کی تاریخ کا بے مثال نمونہ ہی کہا جاسکتا ہے۔نمونے کے طور پر آپ کو بتلاتے چلیں کہ شادی کے دعوت نامے میں نوشہ کی جگہ ''نورِ زمن'' اور'' جگر گوشہ من'' اور دولہن کے بجائے یہہ تحریر نظر آئی ''گل رعنا وسنبل ولے'' اس طرح تاریخ عقد کے لئے ''یوم الاحد'' اور طعام ولیمہ کے لئے ''یوم الاثنین'' کا استعمال کیا گیا ہے۔مزید ملاحظہ فرمائیں کہ افراد خاندان کی جانب سے ان الفاظ'' قدوم میمنت وچشم براہ وامی'' میں شرکت کی دعوت دی گئی۔یہ الفاظ بڑی حدتک کچھ لوگ زور دے کر سمجھنے کی کوشش کرتے نظر آئے مگر ان کے علاوہ ایک لفظ'' عروبہ'' لکھا گیا اس سے لوگ تقریباً نا واقف ہی تھے کہ یہ کون سی تقریب ہے اور کس موقع پر منعقد کی جاتی ہے۔اور اس سے کس طرح انجام دی جاتی ہے اور اس میں عزیز و اقارب و احباب کا کیا کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان دعوت ناموں کی اشاعت اور تقسیم کے بعد جو طوفان اُٹھا اس تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے جن منازل کو طئے کئے گئے ہیں وہی بہتر جانتے ہیں۔ بلاشبہ یہہ رقعہ آگ کا دریا تھا جنھیں ڈوب کر پڑھنا تھا۔جن قریبی احباب کو یہ دعوت نامے ملے انہوں نے اس بارے میں دیگر لوگوں سے بھی پوچھ تاچھ کی مگر سب ہی اس عورت نامے کی تحریر کو سمجھنے اور سمجھانے سے معذرت چاہی۔ ہمارے ایک کرم فرما جنھیں یہہ دعوت نامہ ملا تھا انہوں نے اس کو سمجھنے کی کافی کوشش کی آخر تھک ہار کر انہوں نے سوچا شاید ہمارے محلے کے مولوی صاحب جو درس و تدریس سے وابستہ ہیں شاید وہ اس دعوت نامے کی تحریر سے ہمیں واقف کرواسکیں۔ جب ہم نے اُن سے اپنا مدعا پیش کیا وہ بڑی دیر تک اس کو پڑھتے رہے اور یوں گویا ہوئے کہ یہ تحریر کسی بھی گمان سے پرے بلکہ یقین کی حد تک کہی جاسکتی ہے کہ وہ عربی زبان میں نہیں ہے بلکہ فارسی میں لکھا ہوا ہے اور چونکہ ہم عربی درس تدریس سے وابستہ ہیں لہذا ہم اُن کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔مولوی صاحب سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ایک قریبی دوست جو مقامی کالج میں صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے کام کررہے ہیں وہ ضرور اسے سمجھا دیں گے۔

جب انہوں نے اُن سے ملاقات کی اور اپنی الجھن بتایا وہ دعوت نامے کو پڑھنے کے بعد نہایت دانشورانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں پہلے کالجس میں ایک ہی شعبہ میں اُردو فارسی کی تدریس کی جاتی تھی مگر اب کالجس میں شعبہ اُردو فارسی علیحدہ علیحدہ کام کررہے ہیں اور یہہ دعوت نامہ بلاشک وشبہ فارسی میں تحریر ہے بلکہ جدید فارسی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس لئے زیادہ بہتر ہے آپ کسی فارسی داں ہی سے رجوع کریں۔ ہاں اگر غالب کا کوئی شعر ہوتا ، مابعد جدیدت یا ساختیات کا کوئی نکتہ ہوتا تو ہم ضرور آپ کی مدد کرسکتے تھے۔اب اس دعوت نامے کی تحریر ہمارے کرم فرما پر واضح ہوچکی تھی یہہ رقعہ فارسی میں لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کی ہمارے شہر میں کوئی فارسی داں مل جائے اور اُن کی مشکل آسان کرے مگر معلوم ہوا کہ فارسی داں کا فقدان ہے۔ جو اس زبان کو جانتے تھے اب وہ دُنیا میں نہیں رہے۔ان حالات میں انہوں نے ضروری یہی سمجھا کہ جن صاحب سے یہہ دعوت نامہ وصول ہوا تھا انہیں سے ملاقات کی جائے تاکہ صحیح تفصیلات سے واقف ہوسکیں کہ کس قسم کی تقریب ہے جس میں ہمیں شرکت کرنی ہے۔ جب اُن صاحب سے ملاقات کی تو عقدہ یہہ کھلا کہ ہمارے ایک عزیز جو اس دنیا میں نہیں رہے اُن کے بڑے فرزند کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں دعوت نامے اُن کی اہلیہ کی جانب سے چھپوائے گئے تھے۔ وہ تقریب اسی مہینہ کی ۲۸ / مارچ کو بروز جمعرات منعقد کی جائے گی۔تقریبِ عروبہ کے بارے میں یہ وضاحت کی کہ شادی کے چار ہفتوں بعد دولہا کی جانب سے دولہن کے رشتہ داروں و دیگر عزیز و اقارب کے لئے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا جاتا ہے بس اتنی سی بات سن کر ہمارے دوست کو یوں لگا جیسے کہ بڑے بوجھ سے اُتر آئے۔ جس کے بارے میں وہ کیا کیا اندازے قائم کئے جارہے تھے اور کتنی دشواریوں کا سامنا کررہے تھے۔ ہمارے رفیقِ محترم کی اس علاقے میں اس دعوت ناموں کی شہرت آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔ ہمارے قرب و جوار کے لوگ بطور تبرک کے انہیں حاصل کیا جارہا ہے۔ ان رقعوں کا اس حد تک جنون طاری ہے کہ شادی بیاہ یا کوئی تقریب مقرر ہونے کے بعد نوشہ و عروس کے رشتہ دار اور قریبی احباب ان دعوت ناموں کی تحریر کو ہمارے رفیق محترم سے حصول کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ بلکہ یہہ بھی دیکھا گیا کہ یہہ تحریر ملنے کے بعد ہی تاریخ کا تعین کیا جاتا ہے۔ دعوت ناموں کی اس دیوانگی کے بارے میں یہ روداد جب ہم انہیں واقف کرواتے ہیں تو ہمارے رفیق محترم بڑے معصوم انداز سے کہتے ہیں یہہ تو اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ایک ادنیٰ کوشش کررہا ہوں جسے آپ رفتہ رفتہ فراموش کررہے ہیں۔ ہم آپ کو پہلے ہی بتاچکے ہیں کہ ہمارے رفیق محترم کی خصوصیات میں یہہ بھی شامل ہے کہ وہ آسانی سے کسی بات کو تسلیم کرنے کے قائل نہیں، خواہ اس کے لئے مضبوط دلائل بھی دیئے جائیں۔ اس معاملہ میں ہم اُن سے کیا بحث کرتے سوائے اس کے ہم اُس کو تسلیم کرلیں۔ اب تو دن بدن ہمارے رفیق محترم کا اندازِ تقریر و تحریر اور شدید ہوتا جارہا ہے اور چونکہ ہم بھی ان طوفانوں کا نظارہ کرنے اور اُن کے ہاتھوں مجبور ہوتے جارہے ہیں۔

☆☆☆

عابدہ محبوب
حیدرآباد

# ماں کا دل

چچا جان ۔۔۔۔ چچا جان ۔۔۔۔ میرا اکلوتا چھ سالہ بھتیجا سجو بے تحاشا دوڑتا ہوا آ کر میری پیٹھ کے پیچھے چھپ گیا۔

'' ار۔۔۔۔۔ارے۔۔۔۔کیا ہوا ؟ میں کتاب چھوڑ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ چچا جان ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بچایئے ۔۔۔۔ بچایئے ! امی آ رہی ہیں ! اس نے التجاءً مجھ سے کہا اور لپک کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' دروازے میں بھابی کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں موٹی سی ایندھن کی لکڑی لئے وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھیں۔ غصہ میں ان کا چہرہ اور بھی سرخ ہو چلا تھا۔

بھابی اور سجو کی اس '' بھاگ دوڑ'' سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ آئے دن گھر میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا۔ شاذ و نادر ہی کوئی دن ایسا جاتا جب کہ سجو بھابی کو ستاتا نہ ہو یا محلّہ سے سجو کی شرارتوں کے بارے میں شکایتیں نہ آتی ہوں۔ اور بھابی لکڑی لئے اس کے پیچھے نہ دوڑی ہوں۔ مگر ایک بات بڑے کمال کی تھی سجو پر بھابی کا نشانہ ہمیشہ چوک جاتا۔ پتہ نہیں یہ جان بوجھ کر ہوتا تھا یا غلطی سے میں کبھی نہ جان سکا۔ مجھے تو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ جب جب سجو کوئی شرارت کرتا' بھابی اینٹ یا پتھر یا لکڑی یا بیلن' جو ہاتھ لگ جاتا' لے کر دوڑ پڑتیں اور کچھ ایسا '' تاک'' کر مارتیں کہ لکڑی یا پتھر ایک طرف جاتا اور سجو دوسری طرف کو۔ ظاہر ہے اس وقت کی یہ '' بھاگم بھاگ' ' میرے لئے نئی نہ تھی۔ میں نے حسب عادت مسکرا کر بھابی سے پوچھا '' یہ کیا ہو رہا ہے۔ بھابی؟''

'' تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ''۔ بھابی نے میرا سوال سنا ان سنا کر دیا۔

'' اگر نہیں ہٹا تو کیا مجھے پیٹ دیں گی آپ؟''

'' اسے چھوڑ دو ظفر''۔ اس بار بھی بھابی نے جواب کی بجائے حکم دیا۔

'' میں نے اسے پکڑ تھوڑی رکھا ہے بھابی ؟ دیکھئے۔ آپ ہی دیکھئے''۔ میں نے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' جن سے ابھی تک وہ چمٹا ہوا تھا۔ '' میں نے اسے پکڑ رکھا ہے یا اس نے مجھے جکڑ رکھا ہے؟

دیکھئے، میں ہل تک نہیں سکتا''۔

''سجو! سامنے آ''۔ بھابی نے براہ راست سجو کو حکم دیا۔

''اوں۔۔۔اوں۔۔۔ چچا جان'' سجو نے مچل کر مجھے پکارا۔

''میں کہتی ہوں سجو' سیدھی طرح سامنے آجا۔۔۔۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا''۔ بھابی بدستور غصہ میں تھیں۔

''آپ مجھے ماریں گی۔۔۔۔اوں۔۔۔اوں''۔ سجو رونے کی تیاری کرنے لگا۔

''ماروں گی؟ آج مار مار کر تجھے مردہ کردوں گی۔ دیکھنا!''۔سجو باقاعدہ بین بجانے لگا۔

''ڈھونگی کہیں کا۔ایسے رو رہا ہے جیسے کسی نے مارا ہی ہو۔مانتا ہی نہیں۔ادھر آ''۔

بھابی کے اس حکم پر مجھے ہنسی آ گئی۔آپ ہی سوچئے ایک ماں ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے غصہ سے لال پیلی کھڑی ہو اور اپنے بچے کو حکم دے رہی ہو کہ وہ ''ہنسی خوشی'' اس سونٹے کے زیر سایہ آجائے تو بچہ مانے گا؟ سجو بھی اڑ گیا۔

''نہیں! میں نہیں آؤں گا''۔

''نہیں آئے گا؟'' بھابی دندناتی آگے بڑھیں اور سجو چلاّنے لگا۔

''چچا جان۔۔۔چچا جان۔۔۔'' میں نے آگے بڑھ کر بھابی کا وار روک دیا۔

''چھوڑ وظفر!'' بھابی چڑ سی گئیں۔

''ابھی چھوڑتا ہوں بھابی۔میں دراصل دیکھ رہا تھا کہ۔ارے! اتنی پتلی سی لکڑی لی ہے آپ نے۔ذرا تو موٹی لیتیں!''۔

''چھوڑ وظفر۔یہ مذاق کا وقت نہیں ہے''۔ وہ لکڑی چھڑانے کی فکر میں تھیں۔

''کون مسخرا مذاق کر رہا ہے؟'' گو میں چارہ رہا تھا کہ بھابی کا موڈ بدل دوں۔

''مجھے آج بہت غصہ آرہا ہے۔تم ہٹ جاؤ ظفر''۔ بھابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

''ہاں ہاں! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کا غصہ کتنا خطرناک ہوتا ہے! اسی لئے تو روک رہا ہوں!''۔

''نہیں ظفر آج دیکھ لینا کیسی خبر لیتی ہوں اس نالائق کی۔روز روز کی دل لگی سمجھ لی ہے۔آج مارے بنا میں چھوڑوں گی نہیں۔مجھے چین نہیں آئے گا''۔ بھابی کے تیور بری طرح بدلے ہوئے تھے۔

''آخر ہوا کیا؟ سجو نے کیا کیا؟''

''ابھی کچھ باقی رہ گیا ہے کرنے کو؟ شرارتیں ایک طرف رہیں' محلے والوں کی شکایتیں الگ۔ یہ تو ڑ۔۔۔وہ پھوڑ! میں نے بچہ سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کیا سمجھایا بجھایا۔مگر نالایق نے اب بدمعاشی پر کمر باندھ لی ہے''۔

''بدمعاشی پر؟ کیا سگریٹ بیڑی پینے لگا ہے؟''

''جی نہیں۔۔۔ چور بن گیا ہے پکا چور! آج

تیسری بار میرے پان دان میں سے پھر اس نے پیسے نکالے ہیں ۔ بغیر مجھ سے کہے پوچھے ! میں نے پوچھا تو جھوٹا صاف مکر گیا۔ حالانکہ اماں نے خود دیکھا کہ''۔

''کیوں سجو؟''میں نے بھابی کی بات کاٹ کر مخاطب کیا''پھر تم نے ایسی حرکت کی؟''

''غلطی ہوگئی چچا جان آیندہ نہیں کروں گا۔ توبہ توبہ!''۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنے گالوں کو پیٹنے لگا۔

''پہلے دوبار بھی توبہ ہو چکی ہے۔ مگر پھر آج''۔ بھابی اور بھڑک اٹھیں۔

''لاتوں کے بھوت باتوں سے تھوڑی مانتے ہیں۔ کچھ یادگار نصیحت ملے تو آیندہ غلطی نہیں کرے گا''۔

''خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ بھابی اب کے میرا ذمہ۔ میں سمجھا دوں گا سجو کو۔ اگر آیندہ اس نے ایسی حرکت کی تو میں خود اسے پکڑ کر آپ کو دوں گا۔ وعدہ!۔ بس؟''

میں نے سمجھا تھا بھابی ہمیشہ کی طرح لکڑی پھینک اپنی مسکراہٹ کو سجو سے چھپاتی چل دیں گی۔ مگر ان کے گرجنے سے میں بھی ذرا ڈر رہی گیا۔

''تم کیا سمجھاؤ گے جی؟ اب تک سمجھانے کا کیا نتیجہ نکلا؟ خوب! دادی بھی وارے نیارے کرتی ہیں' باپ بھی لاڈ کرتے ہیں' چچا الگ پشت پر رہتے ہیں۔ بگڑے گا نہیں تو کیا ہوگا۔ اور نام بدنام ہوتا ہے ماں کا۔ ایک ہونے کی وجہ سے بے جالاڈ پیار نے بگاڑ دیا۔ اونھ تمہارے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھاؤں گی آج''۔

''مار سے بگڑ جائے گا بھابی! بچہ ہے' ایک سے دوبار بولنا ہی پڑتا ہے۔ خواہ مخواہ جاہلوں کی طرح غصہ۔۔۔''

''ہاں ہاں ۔۔۔۔ میں جاہل ہوں ۔ مجھے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ بس تم ہٹ جاؤ''۔ وہ خواہ مخواہ لڑنے کے موڈ میں آ گئیں۔

''میں ہٹ جاتا ہوں بھابی ۔ مگر لکڑی تو دیکھئے کہیں بے جا مار پڑ گئی تو آپ خود ہی روئیں گی بیٹھ کر''۔

''روئے میری جوتی! کچھ ہو جائے مر جائے مجھے کیا؟'' میں نے بھابی کو آج تک اس قدر غصے میں نہ دیکھا تھا۔''ایسی نالائق اولاد کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ عزت کی زندگی کے لئے میں اسے جان سے مار ڈالوں گی۔ اس کا خون پی لوں گی!''۔

اچانک سجو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے پیچھے سے نکل بھاگا۔ بھابی چیل کی طرح اس کے پیچھے جھپٹیں۔

''بھاگتا ہے' بھگوڑے! بھاگ' کتنی دور بھاگے گا؟ میں بھی سمجھ لوں گی تجھے''۔

بھابی کے پیچھے میں دوڑا۔ کمرے سے کمرا۔ پھر کمرے سے دالان' دالان سے دیوان خانہ' دیوان خانہ سے صحن' صحن سے پھر دالان۔ سارے گھر میں بھابی اور سجو کی ریس ہو رہی تھی۔ بھابی اپنے ذرا تندرست جسم کو لئے ہانپ ہانپ کر بھاگ رہی تھیں۔

''مجھے دوڑاتا ہے۔ مجھے دوڑاتا ہے۔ اچھا نالائق! ہاتھ تو لگ آج' اچھی طرح دیکھ لوں گی۔

یکا یک سجو کا رخ باہر کے دروازے کی طرف

پلٹا۔ اس سے پہلے کہ سجو دروازہ کا پردہ اٹھا باہر نکل جاتا' بھابی نے موقع ومحل کی نزاکت دیکھتے ہوئے ہاتھ کی لکڑی پوری قوت سے پھینک ماری۔ مگر پردہ سجو کے لئے ڈھال بن گیا۔ حسب معمول سجو صاف بچ گیا۔ اور لکڑی پردے میں اٹک کر لٹکنے لگی ۔ بھابی باہر تو جانہیں سکی تھیں۔ وار خالی جانے کا رنج الگ ۔ مجبوری کی حالت میں کوسنے بیٹھ گئیں۔

''مجھے ستانے والا مرجائے' کوئی سکھ نہ دیکھے۔ غیب سے گولی لگ جائے''۔

ابھی بھابی کی دعائیں ادھوری ہی تھیں کہ سڑک پر سے سجو کی چیخ سنائی دی۔ میں باہر کو دوڑ پڑا۔ سجو مخالف سمت سے آنے والی ایک سائیکل کی زد میں تھا۔ گلی میں چھ سات آدمی بھی جمع ہو گئے تھے۔ سجو کے ہاتھ اور پیر پر معمولی سی خراشیں آئی تھیں۔ مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے چلاّ چلاّ کر رونا شروع کر دیا۔ اور سائیکل والا میری پوچھ گچھ سے پہلے ہی اپنی صفائی میں بولنے لگا۔

''دیکھئے جناب میں نے گھنٹی بھی بجائی مگر بچہ اس قدر بے تحاشہ دوڑتا چلا آ رہا تھا کہ۔۔۔ آپ یقین جانئے میرا کوئی قصور نہیں ہے''۔

بات بھی سچ تھی۔ اس لئے معاملہ رفع دفع کر کے میں سجو کو اٹھا گھر لے آیا۔ بھابی نے لپک کر سجو کو مجھ سے ایسے چھین لیا جیسے عرصہ سے جدا رہی ہوں۔ اور سینے سے لپٹا کر لگیں رونے۔ روتی جاتی تھیں اور سائیکل والے کو کوستی جاتیں تھیں۔

''سائیکل پر بیٹھ کر اپنے آپ کو لاٹ صاحب کی اولاد سمجھ لیا ہے۔ انسان کیسے نظر آئے؟ اندھا کہیں کا! ہائے کسی کا کیا جاتا۔ میری گود اُجڑ جاتی۔ میرا بچہ' میرا لال۔ میرا چاند۔ وہ بے اختیار سجو کو پیار کرنے لگیں۔

اور میں چپ چاپ ایک کونے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک بھابی کے دو الفاظ گونج رہے تھے جو انہوں نے کچھ ہی دیر پہلے کہے تھے۔ مجھے ستانے والا مرجائے کوئی سکھ نہ دیکھے' غیب سے گولی لگ جائے۔

☆☆☆

## تلخ حقیقت

آپ چار دن منظر سے غائب ہو کر دیکھیں لوگ آپ کا نام تک بھول جائیں گے۔ انسان ساری زندگی اس فریب میں گزار دیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اہم ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہونے نا ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا' یہاں تک کہ مرجانے سے بھی کسی کی زندگی پر کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہی لوگ ریسٹ اِن پیس اور فیلنگ سیڈ یا بروکن کا اسٹیٹس دے کر اپنی اپنی زندگی کی رعنائیوں میں گُم ہو جائیں گے۔ یہ وہ تلخ حقیقت ہے جسے ہم جانتے بوجھتے نظرانداز کر دیتے ہیں' اپنی زندگی کو اللہ کے لئے وقف کیجئے اور اللہ کے لئے خود کو جہالت سے نکال کر حق اور سچ کی طرف لوٹ آیئے۔ یہ دنیا چند روز کی ہے' اس میں دھوکہ ہے' یہ ایک فریب ہے اس میں خود کو تباہ نہ کیجئے۔

oOo

طٰہٰ آفندی
حیدرآباد

# مسیحا

ایک تھا بادشاہ بڑا ہی سنگ دل اور بے رحم ۔ اس کے ظلم اور نا انصافی سے شہ پا کر بادشاہ کے قریب رہنے والے اور اس کے ملازم بھی بادشاہ کے نام پر لوگوں پر نت نئے ظلم ڈھاتے رہتے ۔ رعایا بہت پریشان اور غم گین رہتی تھی ۔ دادی ماں نے اپنا پھٹا ہوا لحاف کس کر اوڑھتے ہوئے کہانی جاری رکھی ۔ انہوں نے اپنی چھوٹی پوتی کو اور بھی قریب کرلیا ، جو ٹکٹکی باندھے بڑی دلچسپی سے کہانی سن رہی تھی ۔ اندر کمرے میں سے بہو کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی ۔ چراغ کی مدھم روشنی کمرے اور دالان میں ملگجا اجالا بکھیر رہی تھی ۔۔

کھانستے کھانستے نحیف آواز میں بہو نے پکارا ' کیا بڑی ابھی تک نہیں آئی ؟ پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی ' رات بڑھتی جارہی ہے ۔ کم بخت کو دوا لانے میں اتنی دیر ہورہی ہے' ۔

' بہو ۔ گھبراؤ نہیں ۔ وہ آتی ہی ہوگی ' دادی ماں نے دالان میں سے زور سے کہا ۔ اندر کمرے میں بہو پھر کھانسنے لگی ۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی ۔ اس کا شوہر ٹرانسپورٹ کے دفتر میں چوکیدار تھا ۔ ایک دن ڈیوٹی اور ایک دن چھٹی رہتی تھی ۔ آج ڈیوٹی کا دن تھا ۔ صبح سے بہو کو ہلکا ہلکا بخار تھا جو شام ڈھلے شدت اختیار کر گیا تھا ۔ بخار اور کھانسی جب برداشت سے باہر ہوگئی تو اسی حالت میں ہانپتے کانپتے محلے کے ڈاکٹر کے پاس پہنچی جو پیسے زیادہ لیتا تھا اور دوا کی جگہ عموماً نسخہ تھما دیا کرتا تھا ۔ سولہ سترہ برس کی بڑی بیٹی ساتھ تھی ۔ گھر میں شوہر کے سوا کوئی مرد نہ تھا اور وہ اس وقت ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا اس لیے مجبوراً دوا لانے کے لیے بھی بیٹی ہی کو بھیجنا پڑا ۔

شہر کی آبادی سے کسی قدر دور کالے پتھروں کے علاقے میں غریب آبادی بڑھتی ہی جارہی تھی ۔ دراصل گنجان آبادی والے علاقہ میں کرائے اور رہن سہن کے اخراجات اتنے ہوگئے تھے کہ غریب طبقے کے لوگ چار و نا چار نواحی علاقوں میں آباد ہونے لگے تھے ۔ کالے پتھروں کے علاقے سے بازار جانے کے لیے ایک قبرستان کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا ۔ دوا لے کر آتے ہوئے قبرستان کے قریب بڑی کو دو نوجوان لڑکوں نے گھیر لیا ۔ نہ جانے کب سے یہ اس کی تاک میں تھے ۔ یا پھر اُن کا

معمول ہی ہوگا کہ ویرانے میں اکیلی جاتی ہوئی عورتوں کی آبروریزی کریں۔

بڑی نے شور مچانے کی بہت کوشش کی مگر ایک نوجوان نے مضبوطی سے اس کا منہ بند کردیا اور مشاق لیٹروں کی طرح اسے قبر کی آر میں گھسیٹ لے گئے۔ وحشت زدہ نظروں سے اندھیرے میں وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور بری طرح مچل رہی تھی مگر نوجوان نے اسے چنگل سے نکلنے نہ دیا۔ دونوں نے اسے زمین پر گرادیا اور اس کے کپڑے اتارنے لگے۔ اس کوشش میں بڑی کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے مرد کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوگئی اور بڑی نے اپنی پوری طاقت سے ایک چیخ ماری۔'بب..... بچاؤ..... بچ.....' چیخ اتنی دردناک تھی کہ شاید قبروں میں پڑے ہوئے مردے بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے ہوں۔فوراً ہی دونوں نے جھپٹ کر اس کی چیخ گلے میں ہی دبادی۔

اسے اتفاق ہی کہنا چاہئے تھا کہ حلقے کے دو کانسٹبل گشت کرتے ہوئے قبرستان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ چیخ اور دبی دبی سسکیوں کے آواز نے ان کے قدم روک لیے۔ ایک نے ٹارچ قبروں کے درمیان میں گھمائی تو دونوں مرد اچھل کر بھاگے۔ پولیس والے سکتے میں رہ گئے۔ چندلمحوں کے لیے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر بڑی سسکتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔اور اس کے آنسو بہہ چلے جارہے تھے۔ اندھیرے میں کسی اندھے کی طرح ٹٹول کر اس نے دوا کی شیشی تلاش کی۔ اپنی عزت پر حملے کا اسے اتنا افسوس نہیں تھا۔ جتنا دوا کی شیشی ٹوٹ جانے کا۔ساتھ ہی ایک ہاتھ سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کررہی تھی۔ ان مردوں کی درندگی سے اُس کا بوسیدہ لباس جا بجا پھٹ چکا تھا۔اپنی سسکیوں کے درمیان اسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ دونوں پولیس والے اس کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ٹارچ کی روشنی میں اس کے گدرائے جسم کو بھوکی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔اس نے سکڑ کر سمٹنے کی کوشش کی ایک کانسٹبل ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا' کیوں ری' یہاں قبرستان میں اپنے یاروں سے عشق لڑا رہی تھی؟'۔

بڑی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے دہکتی آگ میں ڈھکیل دیا ہو۔ وہ کانپتے ہوئے لڑکھڑاتی آواز میں بولی' پپ۔ پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ٹارچ بند کردیجئے۔ ان غنڈوں نے اکیلا پاکر میری عزت لوٹنا چاہی تھی۔ خدا کی مہربانی سے آپ لوگ میری مدد کو پہنچ گئے۔ میری ماں بہت بیمار ہے۔ مجھے گھر پہنچنا ہے'۔

'بہت پرانی کہانی ہے..... ہجاروں بار سن چکا ہوں۔کوئی نئی بات کر' وہی کانسٹبل بولا اور ساتھ ہی ٹارچ بجھادی۔

'لے ٹارچ بھی بجھادی۔ بول اب تو خوش ہے' کانسٹبل نے کہا۔اور پھر مڑ کر اپنے ساتھی سے بولا' فتے تو راستے کا دھیان رکھ میں جرا اس لونڈی کو بتاؤں کہ دلاور خان کا نام ہمیشہ یاد رکھے'۔

دوسرا کانسٹبل قبریں پھلانگتے ہوئے راستے کی نگرانی کے لیے چلا گیا۔

'نہیں نہیں، مجھے جانے دیجئے۔رحم کیجئے۔خدا کے واسطے.....' وہ گھگھیانے لگی۔

پولیس کے سامنے ہر مجرم ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ وہی کانسٹبل باچھیں پھار کر بولا۔ لمبی لمبی مونچھوں کے درمیان اس کی مسکراہٹ بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ساتھ ہی جھک کر اس نے بڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا جو دہشت سے سمٹ کر ایک قبر کے تکئے سے چمٹ گئی تھی۔

'مجھ پہ رحم کیجئے۔خدا کے واسطے رحم کیجئے.....' بے ربط لفظوں میں وہ رو پڑی۔

'ڈھکوسلے مت کر، ورنہ تھانے لے جا کر سڑا دوں گا' آنکھیں نکال کر کانسٹبل دہاڑا 'دلاور خاں کے نام سے بڑے بڑے غنڈے کانپنے لگتے ہیں۔تو کس کھیت کی بولی ہے۔پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا۔' جرا بھی آواز نکالی تو ٹینٹوا دبا دوں گا۔چپ چاپ مزے کر لے پھر تو خود ہی بار بار دلاور خاں کے پاس آنے کے لیے نہ تڑپے تو کہنا'۔

'.....اور جب ظلم وستم حد سے زیادہ بڑھا تو زمین اور آسمان کے بادشاہ کو جلال آ گیا۔کائنات نور سے معمور ہوگئی' دادی ماں مزے لے لے کر کہتی گئیں' پھر ایک مسیحا کا ظہور ہوا جس نے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی۔لوگوں کے زخموں پر پھاہا رکھا۔انہیں غموں سے نجات دلائی.....'

'بس کرو دادی ماں، بس کرو.....' داخلی دروازے کے پٹ زوردار آواز سے کھل گئے اور بڑی چیختے ہوئے دہلیز پر گر گئی۔

'کک .....کیا ہوا بیٹی؟' بہو اور دادی ماں نے ایک ساتھ لرزتی آواز میں پوچھا اور دونوں گرتی پڑتی دروازے کی طرف دوڑ پڑیں۔

'کیا نہیں ہوا دادی ماں، سب کچھ ہو گیا.....' بڑی ہذیانی انداز میں کہے جا رہی تھی۔

'بیٹی تو ٹھیک ہے نا؟ سخت بخار کی حالت میں ماں نے بڑی کو بھینچ کر پوچھا۔

مگر بڑی، دادی ماں کی طرف رخ کر کے بولی' دادی ماں، اب کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائے گا اب کوئی نجات دلانے والا نہیں آئے گا کوئی مسیحا پیدا نہیں ہوگا، دادی ماں، کوئی نہیں.....'۔

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔

☆☆☆

## انسان چار قسم کا ہوتا ہے

(۱) ایک شخص جانتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ جانتا ہے' وہ عالم ہے' اس سے سیکھو۔

(۲) ایک شخص۔نہیں جانتا' لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا۔وہ طالب علم ہے اُسے سکھاؤ۔

(۳) ایک شخص۔جانتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔وہ سویا ہوا ہے' اُسے جگاؤ۔

(۴) ایک شخص نہیں جانتا۔اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا۔وہ جاہل ہے' اس سے بچو۔

کچھ دور کنویں کے پاس چلی گئی۔ میں اس کی سستی بھری چال کی

oOo

سعادت احمد

حیدرآباد

# دل نے جسے چاہا

جب متاع عزیز جدا ہوجائے تو زندگی بے رونق ہوجاتی ہے۔ شانو مجھ سے چھین لی گئی' مجھ پر سونا پن چھا گیا اور شہر کی گہما گہمی بھی اچھی نہ لگی۔ اس لئے کُندن نگر آ گیا۔

وہاں میرا ایک دوست فارسٹ کنٹراکٹر رہتا تھا۔ وہ درختوں کی کٹوائی اور ان کی نکاسی میں مبتلا رہتا' اور میں یہاں کی گلی کوچوں میں سرگرداں' آوارہ و پریشاں پھرتا رہتا۔

ایک دن گھومتا گھومتا کُندن نگر کے مضافات میں نکل گیا۔ آگے پہاڑ پر جنگل لہلہا رہا تھا۔ میں اس میں گھومتا پھرتا پہاڑوں سے دوسری طرف اتر گیا۔

سامنے بستی بڑی پرافضا نظر آئی۔ ایک راہ گیر نے بتایا کہ یہ بستی تلسی گاؤں سے موسوم ہے۔ بہت دیر تک یہاں کی آب وہوا سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر بستی کے باہر کی آب وہوا کا مزہ چکھنے کے لئے نکلا۔ کچھ دور جامن کا پیڑ دکھائی دیا' اس کے ہرے ہرے پتوں سے بھری ڈالیاں خوشبودار سبک ہواؤں سے لچک رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا' میں جا کر پیڑ کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ پیڑ سے لگا ایک چھوٹا سا کویلو کا مکان تھا۔ یکا یک اس میں سے ایک حسینہ خراماں خراماں لہکتی مہکتی مٹی کا گھڑا لئے لہروں میں بہہ گیا۔ وہ پانی کے لے کر میرے آگے سے کب گزر گئی مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ میں انتظار میں تھا' وہ گھر سے پھر کب نکلے گی۔؟ وہ گھر سے نہیں نکلی شام ہونے لگی اور میں بستی میں چلا گیا۔

دوسرے دن آ کر جامن کے چھایہ میں بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ سے دور ہٹ کر کنویں سے پانی لانے کے لئے جانے لگی۔ میں پیڑ سے ٹیک لگائے کتاب پڑھتا ہوا آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ کئی دن تک ایسا ہوتا رہا۔ وہ پانی سے بھرا گھڑا لے کر گھر میں گھس جاتی پھر نہ نکلتی' اور شام ہونے سے پہلے میں بستی کی طرف چلا گیا:

تُلسی گاؤں کے باہر ہنومان ٹیکری تھی' روز آنہ مجھے یہاں سے ہوکر جامن کے پیڑ تک جانا ہوتا۔ ہنومان ٹیکری کے قریب پیپل کینیچے آج ناگیّا پتھر پر کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ اس کی بھینس بیٹھی جگالی کر رہی تھیں ایک بھینس ایک بھینسا مقصد میں کامیاب ہونے کی لگن میں مصرف تھا ایک کُتا اُچھل کود کرنے والی بھینس اور بھینسے کی ٹانگوں میں آ گیا' اور چلاتا ہوا دم دبا کر ایک طرف بھاگا!

مندر کے بائیں طرف تھوڑوں دور سنکیسر کے نیچے رامالو پار کی بھٹی سرد پڑی تھی۔اس کا پلنگ خالی تھا۔مجھے یاد آیا آج اتوار ہے بستی میں بازار پھرتا ہے۔راما گھر پیاں چھرے اور چاقو بنا کر بستی میں فروخت کرنے کے لئے گیا ہوگا۔ پارودھوبن کی کوٹھری پر تالا پڑا ہوا تھا' گدھے کے استھان پر اس کا تازہ فضلا پڑا ہوا تھا' ابھی ابھی پارو گدھے پر کپڑے لاد کر گھاٹ پر گئی ہوگی۔

رامالو ہار کا بیٹا راجو پارودھوبن سے عشق لڑا رہا تھا۔ اس کی کوٹھری کے آگے ایک پتھر پر بند دروازے پر ٹکٹکی لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔مجھے دیکھتے ہی سلام کہتا ہوا گھبرا کر اٹھا۔جیسے میں نے اس کی آنکھوں کی چوری پکڑ لی ہو۔پھر اس نے دور جامن کے پیڑ کی طرف دیکھا' اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔اس کی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی تھی ''صاحب تم بھی تو جامن کے نیچے بیٹھ کر لکشمی کو دیکھا کرتے ہو''۔میری نگاہیں خود بخود جھک گئیں' اور بڑبڑانے لگا مجھے جامن کے پیڑ کی چھاؤں اچھی لگتی ہے' اس لئے بیٹھ جاتا ہوں۔مجھے لکشمی سے کیا سروکار! یکا یک وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا جیسے اس نے میری بات سن لی ہو۔پھر میں نے چونک کر جامن کے پیڑ کی طرف دیکھا۔ کچھ دور کنویں پر لکشمی ڈول سے پانی نکال رہی تھی۔

راجو بھی لکشمی کو دیکھ کر مسکرا اُٹھا۔ صاحب جی! شہر کے لگتے ہو۔میری آنکھوں کی چوری پکڑنے سے پہلے آپ اپنی چترائی پر بھی غور کر لیجئے۔میں اس کی خندہ دنی کو پس پشت ڈال کر آگے بڑھ گیا اور تھوڑی دیر میں جامن کے پیڑ تلے آ کر بیٹھ گیا۔لکشمی بہت خوبصورت تھی۔اس کی آنکھیں شانو کی آنکھوں سے بہت ملتی جلتی تھیں۔وہ شانو کی طرح اٹھلا کر چل رہی تھی اور میں اس کی قد و خال میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ایک غیبی صدا میرے کانوں سے ٹکرائی ''تم نے شانو کو دل سے چاہا، وہ تم سے چھین لی گئی۔اب تم لکشمی پر نثار ہو رہے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھی کوئی زبردستی جھپٹ لے جائے؟''۔آواز ہوا کے دوش پر چلی گئی۔

میں نے سوچا ایک بار صرف ایک بار قریب ہو کر اس سے بات کر لوں گا۔۔۔ویسے میری نیت اسے اپنانے کی نہیں! لکشمی شانو کے روپ میں کنویں پر کھڑی تھی۔موسم گرما کا تھا پیاس لگ رہی تھی۔میں کنویں کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔دل اُچھلنے لگا۔۔۔خبردار! میں نے دل کو ٹوکا ''اپنے پر قابو رکھو! ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔پیاس بجھا کر واپس آ جائیں گے''۔

پیاس کی شدت اور بڑھ گئی' میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا کنویں پر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ اُچھل پڑی۔پھر شرما کر اپنی اوڑھنی کا کونا دانتوں تلے دبا لیا۔میرا دل مچلنے لگا۔پھر مئے کے پیالے جیسی اس کی ڈورے دار آنکھوں نے کہا ''لگتا ہے جنم جنم کے پیاسے ہو''۔

''ہاں۔لکشمی میں بہت پیاسا ہوں''۔اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کا کٹورا مثل ہلال جھک گیا۔اور گردن اٹھا کر اس کی آنکھوں میں گم ہو گیا۔اس کی آنکھوں کے ڈورے اور سرخ ہو گئے تھے۔وہ ڈول سے پانی ڈالتی رہی۔دل کو بھلا پانی سے کیا تشفی ہوتی۔وہ آنکھوں سے پیتا رہا۔میں اسے ڈانٹتا رہا کہ اس سے محبت کا اظہار نہ کرنا' اسے دیکھ کر ہی ہم گذارا کر لیں گے۔تھوڑی دیر بعد میں جامن کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔

ایک دن وہ اپنے مٹی کے گھڑے میں پانی بھر رہی تھی کہ کہیں سے ایک موٹی گلّی آئی اور گھڑے پر پڑی' پنچ کی آواز کے ساتھ گھڑا پھوٹ گیا۔وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بہت دور کھڑا ایک نوجوان چیخ رہا تھا ''لکشمی میں یہاں ہوں'' اور وہ جلدی جلدی اس کے قریب آنے لگا۔لکشمی دوڑ دوڑ کر میرے قریب آ گئی۔'' باپو مجھے بچا لیجئے اس درندے سے۔یہ ہمیشہ مجھے چھیڑا کرتا ہے''۔میں اس کی ہمت بندھاتا ہوا بولا'اس لوفر سے تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔وہ خوف سے لرزتی ہوئی بولی۔''یہ پرتاب بڑا بدمعاش اور آوارہ ہے''۔اتنے میں لکشمی کا پیتا آ گیا۔میں نے اس سے کہا۔''آئندہ سے لکشمی کو پانی لانے کنویں پر بھیجا نہ کرو''۔اس واقعہ کے بعد اس کا پیتا حالات کی نزاکت بھانپ کر لکشمی کو اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔

پرتاب ضلع کندن نگر کے بڑے بھگیرتھ ساگر کا بیٹا تھا۔بھگیرتھ ساگر موجودہ رولنگ پارٹی کی طرف سے کندن نگر کے یم۔یل۔اے چنے گئے تھے اطراف واکناف میں ان کا بڑا دبدبہ تھا۔پرتاب ان کا بیٹا شہر سے پڑھ کر زمینات سنبھالنے تلسی گاؤں آ گیا تھا۔تلسی گاؤں میں ان کا ایک بڑا آم کا باغ تھا جس کی نگرانی لکشمی کا باپ رامنتو کیا کرتا تھا۔بھگیرتھ ساگر کے پاس کتنے ہی چھوٹے کسانوں کی زمینات نہیں تھے کہ سال پہلے خشک سالی سے پریشان ہوکر اپنے زمینات کوڑیوں کے مول بیچ کر تو شہر کوچ کر گئے تھے اور کچھ کسان بڑے زمینداروں کے پاس نوکر ہو گئے تھے۔اسی طرح رامنتو بھی اپنی زمین بھگیرتھ ساگر کے پاس رہن رکھ سوچ رہا تھا کہ شہر کے بجائے کسی بڑے زمیندار کے ہاں نوکر ہو جائے۔

بھگیرتھ ساگر رامنتو کی مخالفت اور ایمانداری سے واقف تھے'اسے اپنے آم کے باغ کی نگرانی کے لئے نوکر رکھ لیا۔تلسی گاؤں میں چند مسلمان بافندوں کے مکانات تھے 1948 میں ہندوستان کی آزادی کے وقت اقلیتوں پر زیادتیاں ہونے لگیں تو مسلمان خوف زدہ ہوکر شہر منتقل ہو گئے۔

ایک مسلم گھرانہ رہ گیا تھا سکندر اس کا گھر سکندر اس گھر کا ایک چراغ تھا وہ بچپن ہی سے بڑا محنتی اور ہوشیار تھا بڑا ہوکر وہ اپنی زمین میں کپاس کی کاشت کیا کرتا تھا'اور زمین کے ایک حصے میں ترکاریاں لگایا کرتا تھا۔

رامنتو کی بیٹی لکشمی بچپن سے سکندر کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔گاؤں میں ہر اتوار بازار بھرا کرتا سکندر کی زمین میں اُگی ہوئی ترکاری لکشمی بازار لے جا کر بیچا کرتی۔لکشمی کو سکندر بہت پسند تھا اس کو محنت کرتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا کرتی تھی۔لکشمی سے متاثر ہوکر سکندر نے اس سے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لینے کی پیشکش کی تو لکشمی نے کہا کہ بڑی بہن کی شادی کے بعد ہی میں تم سے شادی کرلوں گی۔لکشمی کی ایک اندھی اور پولیوزدہ بہن تھی۔پولیوزدہ بہن اس سے بڑی تھی' اُس کی دو ٹانگیں ناکارہ تھیں'لیکن دھڑ کا حصہ بالکل اچھا تھا۔

سکندر کا ایک دوست' رستم کُندن نگر کا رہنے والا تھا' اکثر اس کے پاس تلسی گاؤں آیا کرتا تھا۔وہ بے روزگار تھا۔ ایک روز سکندر نے اپنے دوست سے کہا کہ میں تمہیں ایک بڑی رقم کاروبار کے لئے قرض دینے تیار ہوں۔رستم سن کر خوش ہو گیا۔

''لیکن ایک شرط ہے؟'' ''وہ کیا شرط ہے؟''

تعجب سے رستم نے پوچھا''۔''وہ یہ کہ ایک لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانا ہوگا !''۔''یہ کونسی بڑی بات ہے !'' رستم مسکرا کر بولا' میں اکیلا ہوں مجھے بھی سہارے کی ضرورت ہے''

سکندر نے رستم کو ایک روز لکشمی کی بہن گوری کو دکھایا۔اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی رستم اس پر فریفتہ ہوگیا۔ سکندر اپنے دوست کو اندھیرے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا' ایک دن رستم سے بولا'' گوری اپاہج ہے''۔یہ سنتے ہی رستم سرد ہوگیا۔دوست کو خاموش دیکھ کر سکندر نوٹوں کا بنڈل دیتے ہوئے بولا۔یہ رہی کاروبار کے لئے تمہاری رقم اور بولا ، صرف پیروں سے معذور ہے' دھڑ صحیح وسالم ہے لڑکی کا ۔ رستم بڑی دیر تک اپنے دوست سکندر کو دیکھتا رہا' پھر پوچھا، بھائی سکندر تمہاری آنکھ میں آنسو؟ شاید مجھے روپے دینے سے تمہارا دل مطمئن نہیں ہے کیا ۔؟''نہیں میرے دوست ۔ایسا نہیں ہے ۔میری آنکھوں سے نکلنے والے آنسو تمہاری بے تعصبی ،سمانتا پر عقیدت پیش کر رہے ۔تم رہے ایک اونچی ذات کے،اور وہ مادیگا طبقہ کی اپاہج لڑکی بھائی یہ تمہاری قربانی کے آگے یہ میرے روپیوں کی کوئی حقیقت نہیں ۔!

رستم چیخا ۔میرے دوست ۔'' اور بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔

ایک دن رامنتو بھگیرتھ ساگر کے پاس لکشمی کو لے کر اپنی معذور بیٹی کی شادی کے لئے روپے قرض لینے گیا تھا۔وہاں پرتاب بھی تھا۔لکشمی کو دیکھ کر پرتاب اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔رامنتو! چھوٹی ذات کی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔چھوٹے بابو میں آپ کا مطلب ۔۔۔

جھٹ بھگیرتھ رامنتو کی بات کاٹ کر اپنے بیٹے کی طرف فخر سے دیکھتے ہوئے بولے''دیکھو!اب کے الکشن میں مجھے خود روپیوں کی ضرورت ہے،تمہاری کیا مدد کروں ۔؟

رامنتو بھگیرتھ ساگر کے پاس سے نامراد لوٹ آیا تھا جب معذور بیٹی کی شادی رستم سے ہوگی تو لکشمی کی اندھی نے سکندر کو لاکھوں دعائیں دے ڈالیں ۔لکشمی کا تو خوشی کا کوئی انتہا نہ تھا۔وہ جھومتے ہوئے دل ہی دل میں بولی ایسے مہمان انسان کی شریک حیات بننا اس کے لئے قابل فخر بات تھی۔

دونوں نے اقرار کرلیا کہ اب کے بھاگن کی پہلی پھوہار میں شادی رچالیں گے۔کئی دن سے سکندر محسوس کر رہا تھا کہ پرتاب لکشمی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آرہا ہے ۔ اس نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ پرتاب ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے اس سے مل کر اسے سمجھا دینا بہتر ہے ۔پرتاب شہر کا تعلیم یافتہ اور عزت دار گھرانے کا لڑکا ہے،وہ سمجھ جائے گا۔

ایک دن سکندر پرتاب سے مل کر بولا ۔پرتاب انّا آپ بڑے باپ کے بیٹے ہیں' اور لکشمی مادیگا طبقہ سے تعلق رکھتی ہے' اور وہ غریب ماں باپ کی بیٹی ہے اگر آپ اس طرح عزت کے ساتھ کھیلیں گے؟ وہ قبیلے میں بدنام ہوجائے گی۔

ارے سکندر تو میرے بیچ نہ آئے تو ہی اچھا ہے تو نے وہ مثل سنی ہوگی نا۔ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چیونٹی' کہیں تیرا بھی حشر چیونٹی جیسا نہ ہوجائے ۔! ارے تو سمجھتا ہی نہیں چھوٹی ذات والوں کی عزت بھی کیسی؟ کون عزت

ہوتی ہے؟ پھر ترش روی سے بولا سکندر ے بھی سن لے‘ اب پھر مجھ سے اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔!

سکندر پیچ وتاب کھا کر پرتاب کے ہاں سے آ گیا۔ ایک روز لکشمی امرائی کی باڑ کے قریب جلانے کی لکڑیاں اکٹھا کر رہی تھی‘ اسے دیکھتے ہی پرتاب کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے سوچا موقع اچھا ہے اسے دبوچ لینا چاہئے۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ ایسا کرنے سے وہ چیخنے لگے گی اور معاملہ بگڑ جائے گا‘ اسے دھوکے اور فریب سے دام کر لینا ہی اچھا ہے! وہ اس کے قریب آ کر بولا ’’لکشمی! تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ تیرے پیتا جھاڑ پر سے گر کر زخمی حالت میں تڑپ رہے ہیں‘‘۔ لکشمی نے لکڑیاں اکٹھا کرنا چھوڑ کر پوچھا ’’تیرے پیتا جی کہاں ہیں؟‘‘۔ ’’امرائی میں پڑے درد سے تڑپ رہے ہیں۔‘‘ پرتاب ماتھا پیٹتا ہوا بناوٹی افسوس بھرے لہجے میں بولا

لکشمی امرائی کی طرف بھاگی‘ امرائی میں اِدھر اُدھر پیتا کو تلاش کرنے لگی۔ پرتاب اس کے پیچھے ہی تھا۔ مڑ کر لکشمی نے پوچھا میرے پیتا جی کہاں ہیں؟ وہ رونے لگی۔ امرائی میں ایک خوبصورت فلیٹ Flat بنا ہوا تھا پرتاب نے اس کی طرف اشارہ کیا ’’تیرے پیتا اس کے اندر ہیں‘‘۔ پیتا جی!! وہ پکارتی ہوئی فلیٹ میں گھسی، پرتاب بھی اس کے ساتھ گھس کر اندر سے دروازہ لگا لیا۔ لکشمی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پیتا جی کو پکارنے لگی۔ پرتاب بولا۔ پیتا کو کیوں پکار رہی ہو۔ میں ہوں نا‘‘ یہ کہہ کر انجانی لکشمی پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں میں دیر تک دھکم دھکا ہوتا رہا بالآخر پرتاب لکشمی کو زیر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اس نے حیوانیت کی ساری حدیں پار کر دیں۔ بہت دیر بعد وہ فلیٹ سے نکل کر چلا گیا۔ آج لکشمی نے سکندر سے ملنے کا وعدہ کیا تھا‘ وہ بہت دیر تک املی کے نیچے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا‘ اچانک منگل سائنا نے کہا ’لکشمی کو امرائی میں جاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے‘‘۔ سکندر دوڑا دوڑا امرائی میں آیا‘ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ اچانک اسے فلیٹ نظر آیا۔ دروازہ کھلا تھا‘ جلدی جلدی وہ دروازے کے قریب آ کر رک گیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے سر پر ایک وزن چیز سے دے مارا‘ اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے دن افواہ پھیل گئی کہ سکندر لکشمی کو بھگا لے گیا۔

گاؤں کے لوگوں نے سکندر کے ضعیف ماں باپ کو ستانا شروع کر دیا۔ اور ایک دن ہجوم نے سکندر کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ اس کے ماں باپ گھر کے اندر تھے‘ باہر سے لوگوں نے گھر کو آگ لگا دی۔ پرتاب کی رنگ رلیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ ایک روز بھگیر تھ ساگر امرائی میں آ کر رات کو فلیٹ میں رہ گئے۔ آدھی رات کو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بھگیر تھ ساگر گہری نیند میں تھے اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دروازہ کھولا۔ لکشمی چلا رہی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ اس نے میرا گھڑا پھوڑ ڈالا‘‘ بڑی غضب ناک آواز سے بول رہی تھی۔ بھگیر تھ ساگر کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ لکشمی سکندر کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ اتنے میں سکندر آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بھاگنے لگے۔ بھگیر تھ ساگر آنکھیں ملتے ہوئے دیکھنے لگے اور دل میں کہنے لگے کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ

رہے ہیں ۔نہیں یہ خواب نہیں ہے' یہ حقیقت ہے ۔ وہ غصے میں دانت کٹکٹاتے ہوئے منہ ہی منہ میں بولے ۔ان کے سامنے یہ گستاخی ۔پھر اچانک لکشمی غائب ہوگئی' اور سکندر اکیلا کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔

اتنے میں لکشمی کا باپ رامنتو آ گیا ۔بھگیرتھ ساگر بولے'' میں نے تمہاری بیٹی کو دیکھا ہے ۔وہ امرائی میں سکندر کے ساتھ موجود ہے ۔شاید آپ کی نظروں کو دھوکہ ہوا ہے مالک ! وہ بھیگی آواز میں آنسو پونچھتا ہوا بولا ۔وہ آوارہ میری بیٹی کو بھگا لے گیا ہے ۔بھگیرت فلیٹ کے اندر جاتے ہوئے بولے'' پریشان کیوں ہوتے ہو۔اب تم جاؤ۔صبح پولیس ڈھونڈھ نکالے گی'' اور اندر سے انہوں نے دروازہ بند کرلیا۔

رامنتو زیر لب کہنے لگا'' سکندر اور لکشمی امرائی میں کہاں سے آ گئے ؟ مالک کی آنکھیں دھوکہ کھا گئی ہوں گی !'' وہ ابھی امرائی کے گیٹ سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ بھگیرتھ ساگر چیختے چلاتے فلیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے '' کیا ہوا مالک'' ! رامنتو پلٹ کر دوڑتا ہوا آیا۔بھگیرتھ ساگر پر ہیبت سے لرزہ تھا۔اندر۔اندر۔ہاں ! ہاں مالک ۔کہیے۔ اندر کیا ہے ؟ تمہاری لکشمی اور سکندر کی لاشیں !۔لاشیں ؟ !'' حیرت زدہ رامنتو فوراً اندر گھسا اور تھوڑی دیر بعد باہر آ گیا۔ مالک فلیٹ سارا چھان مارا وہاں کوئی لاش واش نظر نہ آئی !'' کوئی لاش نہیں؟ خوف سے بھگیرتھ ساگر کی آنکھیں باہر نکل آئیں' چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔رامنتو ! ڈھارس بندھاتا اور تسلی دیتا ہوا بھگیرتھ ساگر کے ساتھ صبح تک چوکھٹ پر بیٹھا رہا ۔صبح صبح پرتاب پتا سے ملنے آ گیا ۔ رامنتو اور بھگیرتھ ساگر کو فلیٹ کی دہلیز پر بیٹھا دیکھ کر ٹھٹکا۔ پیتا جی ۔ پرتاب چلّایا ۔رامنتو ڈر کر بھگیرت ساگر کے قریب سے اٹھ گیا ۔ پیتا جی ! آپ اس اچھوت کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں؟ ۔ بیٹے آؤ ! یہاں بات تو سُنو ! اپنے بیٹے سے رات گذرا ہوا واقعہ سنایا۔ پیتا جی ! وہ ایک استہزایہ قہقہہ لگا کر بولا ۔ یہ ناممکن ہے ۔کئی دن ہوئے سکندر،لکشمی کو لے کر جانے کہاں غائب ہوگیا۔وہ مونڈھے اُچکاتے ہوئے بولا ۔ پیتا جی کل آپ دن بھر کلکٹر صاحب کے بنگلے میں معمول سے زیادہ شراب پیتے اور مچھلی کھاتے رہے' ہاضمہ خراب ہوگیا ہوگا۔اس لئے میں منع کر رہا تھا۔خیر چھوڑیئے' آپ گھبرایئے مت۔ آج رات میں آپ کے ساتھ یہاں رہوں گا '' ''ہاں بڑے مالک !'' رامنتو نے کہا گھبرایئے مت میں بھی یہیں رہوں گا اور اگر لکشمی آجائے تو اُس کی چوٹی پکڑ کر گھر لے جاؤں گا''۔

بھگیرتھ ساگر کلکٹر سے کہہ کر پولیس منگوایئے ۔ رات آئی پرتاب خرّاٹے لیتا ہوا سو گیا لیکن بھگیرتھ ساگر کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگے ۔ ایک طرف رامنتو سو رہا تھا اور دوسری طرف پولیس جوان اونگھ رہے تھے۔آہستہ سے انہوں نے کھڑکی بند کرلی' تھوڑی دیر کے بعد پولیس والوں کے درڑنے کی آوازیں آنے لگیں ۔لڑکی کی آواز اُدھر سے آرہی ہے ۔ پکڑو اُسے ۔ اچانک لڑکی پکاری'' میرا گھڑا ۔ارے میرا گھڑا پھوڑ ڈالا'' بھگیرتھ ساگر یم ایل اے خیموں کی آوازیں سن کر فلیٹ سے باہر نکلے ۔رامنتو ایک طرف کندھے پر کمبل ڈالے بھاگ

رہا تھا ''لکشمی بیٹی رک جا۔ میری بات تو سن۔

رات کی سیاہی میں پولیس جوانوں کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ چیخیں دب گئیں۔ امرائی میں سناٹا چھا گیا۔ سرچ لائٹ کا انتظام کیا گیا تھا' انسپکٹر سدانند نے سرچ لائٹ آن کرنے کے لئے کہا۔ ساگر صاحب بیٹے کو پکارے' فلیٹ میں سے کوئی آواز نہ آئی۔ انہوں نے اندر جا کر دیکھا کہ پرتاب کا بستر خالی پڑا ہوا تھا۔ امرائی کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی ۔ اچانک ایک طرف سے پرتاب کی آواز آئی ''پیتا جی بچایئے ۔ وہ مجھے لئے جا رہی ہے۔ جس طرف سے آواز آ رہی تھی انسپکٹر اور پولیس کے جوان اُس طرف دوڑے۔ آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب سحر ہونے لگی تھی۔

انسپکٹر سدانندن پولیس کے جوان اور لکشمی کے باپ نے امرائی کا کونا کونا چھان مارا۔ بھگیرتھ ساگر اپنے بیٹے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ یکا یک فلیٹ کے عقبی حصہ سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں، انسپکٹر پولیس کے جوان اور رامنتو عقبی حصہ میں آ گئے۔ پرتاب مٹی کے اندر پورا دھنسا ہوا تھا' اس کا ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا جسے بھگیرتھ ساگر پکڑ کر روتے چیختے زور لگا رہے تھے ''میرا بیٹا مٹی کے اندر اترتا جا رہا ہے۔ ارے ہے کوئی نکالنے والا۔ وہ پوری قوت کے ساتھ پرتاب کا ہاتھ کھینچ رہے تھے اور وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ مٹی کے اندر اترتا جا رہا تھا۔ اچانک ان کا ہاتھ پرتاب کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ پیچھے کی طرف چت گر پڑے۔ تڑپ کر پھر اُٹھے' زار و قطار روتے ہوئے بولے ''وہ دیکھو میرا بیٹا!'' پرتاب پورے کا پورا زمین کے اندر تھا صرف اس کے سر کے بال دکھائی دے رہے تھے۔ ''انسپکٹر کیا دیکھ رہے ہو بھگیرتھ ساگر گڑگڑائے'' جلدی سے میرے بیٹے کو زمین کے اندر سے نکالو!''۔

بیلچوں اور پھاوڑوں سے مٹی ہٹائی گئی۔ پرتاب کو مردہ حالت میں نکالا گیا۔ پولیس والوں نے کہا اس گڑھے کے اندر اور بھی لاشیں دکھائی دے رہی ہیں۔ انسپکٹر نے گڑھے کو کشادہ کرنے کا حکم دیا۔ اس میں سے لکشمی اور سکندر کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ گڑھے کے پشتے پر تین لاشیں رکھ دی گئیں اتنے میں گاؤں کے لوگ بھی آ گئے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ یکا یک میرا دل تڑپتا ہوا چلّایا۔ اب کسی سے محبت نہ کروں گا۔

اچانک گڑھے کے پشتے کی مٹی ڈھلنے لگی اور تین لاشیں گڑھے میں گر گئیں۔ لوگوں نے لاشوں کو نکال کر گڑھے سے اوپر رکھ دیا' پھسپھسی مٹی صاف کی گئی تاکہ لاشیں دوبارہ گڑھے میں گر نہ جائیں لیکن مٹی ڈھلتے ڈھلتے لاشوں تک آ گئی گڑھا اور وسیع ہو گیا اور پھر لاشیں گڑھے میں گر گئیں۔ اچانک گڑھے سے مٹی خود بخود اچھلنے لگی۔ لاشوں کو گڑھے میں چھوڑ کر لوگ گاؤں کی طرف بھاگے۔ بھگیرتھ ساگر پر خوف و دہشت اس قدر چھا گئی تھی کہ انہوں نے پھر کبھی امرائی کا رخ نہ کیا۔

کئی دنوں بعد میں یہاں آیا ہوں۔ ہری بھری امرائی سوکھ گئی ہے۔ کئی برساتیں آئیں لیکن اموا کے پیڑ ہرے نہ ہوئے اور نہ یہاں گھاس اُگی۔ ایک چٹیل میدان دکھائی دے رہا ہے۔

☆☆☆

ثریا جبین

گرین منشن۔فلیٹ نمبر B-7

10-3-276/277

ہمایوں نگر۔حیدرآباد (تلنگانہ اسٹیٹ)

# لختِ جگر کی خاطر

پچھلے دو ماہ سے راسیہ کی زندگی میں طوفان اٹھ رہے تھے وہ ان تھپیڑوں سے خود کو بچا نہیں پا رہی تھی۔اس کے جذبات اس کے اختیار میں نہیں تھے۔جن جذبات آرزوؤں، تمناؤں کو اس نے تھپک کر سلا دیا تھا وہ پھر سر اٹھانے لگے تھے۔

اسکول جانے کے لئے باہر نکلتا تو ایک خوبرو نوجوان اسے معنی خیز نظروں سے گھورتا رہتا۔راسیہ نظر انداز کرتی آ رہی تھی۔لیکن خیالات پر کس کا بس ہے؟ وہ تو بن بلائے مہمان کی طرح وارد ہوتے ہیں۔بار بار اس نوجوان کا چہرہ سامنے آتا مسکراتا ہوا۔میں خود تہی دامن ہوں۔اسے کیا دے سکتی ہوں۔وہ خود کو سمجھاتی۔

راسیہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش حال زندگی گذار رہی تھی۔دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔شادی کے دو سال بعد ننھا ساجد اُن کی زندگی میں خوشیاں بکھیرنے آ گیا۔وہ دونوں بہت خوش تھے۔لیکن تقدیر بھی کبھی کبھی کیا گل کھلاتی ہے۔اُس دن شام راسیہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی جو آفس سے ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

کئی فون کر ڈالے لیکن کوئی جواب نہیں۔وہ بڑی فکرمند اور پریشان تھی۔معاً دروازے پر دستک ہوئی وہ دوڑ کر گئی، دو پولیس کے جوان کھڑے تھے۔اسے بتایا کہ اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔مارے خوف و رنج کے وہ تھرتھرا اُٹھی۔یہ کیسے ہوگیا۔اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔قسمت نے کیا پلٹا کھایا تھا۔مسرتوں کی پھلواری اچانک خزاں کی زد میں آ گئی تھی۔اس کا پیارا نشیمن جل گیا تھا۔زندگی کی بہاریں روٹھ گئی تھیں۔اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔نہ باپ نہ بھائی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا۔بیٹے کا خیال آیا ''میرے دل کا ٹکڑا! اسے گلے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔اب وہی اس کا واحد سہارا۔زندگی کا حاصل تھا۔اس نے عہد کر لیا کہ وہ بیٹے کی پرورش و تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑے گی اور خود کو اس کی بنانے کے لئے وقف کر دے گی۔محلے کے ایک نیک شخص نے اس کی مدد کی اور اسے ایک اسکول میں نوکری دلوادی اور اسکول کے قریب ہی ایک چھوٹا مکان کرایہ پر مہیا کر دیا۔راسیہ اپنی زندگی کی گاڑی ڈھکیلنے لگی۔اس گھر میں آ کر اس کی زندگی میں تبدیلی آ گئی۔اس نے رنج و غم و افسردگی کا لبادہ اتار پھینکا۔اب

وہ صرف اپنے بیٹے کے لئے جینا چاہتی تھی جو اس کی زندگی کا محور تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سارے غم بھول جاتی تھی ۔ اسکول میں اس نے ساجد کو شریک کر دیا تھا ۔ وہ اسے ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی ۔

اب زندگی کے سفر میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا ۔ ساتھ کی ٹیچرز اُسے دوسری شادی کا مشورہ دیتیں ۔لیکن وہ ٹال جاتی ۔ کچھ دن سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ جب وہ اسکول جانے کے لئے باہر نکلتی ہے تو ایک نوجوان اسے تکتا رہتا ۔ پہلے تو اس نے توجہ نہیں دی ۔ پھر ایک دن دیکھا کہ وہ اس کے بچے کو چاکلیٹ دے رہا ہے ۔اس نے منع کیا ۔ تو کہنے لگا ۔ ''مجھے آپ کا بچہ بہت پیارا لگتا ہے ۔''

پھر کچھ دن بعد وہ بچے کے لئے کھلونے ،ٹافیاں نہ جانے کیا کیا لے آیا ۔اب وہ بچے کے ساتھ گھر آنے لگا ۔ جیسے ہی وہ گھر آتا ۔ بچہ دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ۔ وہ بڑے پیار سے بچے کو گود میں اٹھاتا ۔خوب ہنساتا ۔ پیار کرتا اور اس کے ساتھ پھر کھیلنے لگ جاتا ۔ بچہ بسکٹ چاکلیٹ لے بہت خوش ہوتا اور خوشی سے اُچھلتا اور ماں سے کہتا ''دیکھو دیکھو انکل لائے ہیں'' وہ چونک کر کبھی بچے کو دیکھتی کبھی ابرار (نوجوان) کی طرف دیکھتی تو اسے مسکراتا پاتی ۔جیسے ہی راسیہ کی نظریں اس سے چار ہوتیں راسیہ کی شرمندگی کے احساس سے نظریں جھک جاتیں ۔ بچہ رفتہ رفتہ ابرار سے مانوس ہوتا گیا ۔ بچے کی آڑ لے کر ابرار کسی نہ کسی بہانے آ جاتا ۔ راسیہ سے خوب ہمدردی اور خلوص جتاتا ۔ راسیہ غیر محسوس طریقے سے اس شخص سے متاثر ہونے لگی ۔اس کی لفاظی اور اپنائیت وخلوص کے جال میں پھنسی جا رہی تھی ۔ وہ روز بروز اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا ۔ وہ کچھ کہنا چاہتی لیکن وہ اپنے خلوص ومحبت کی دہائی دیتا کہ وہ بے بس ہو کر رہ جاتی ۔

رات کے اندھیروں میں جاگی آنکھوں سے خواب بنتی ۔اب وہ ماضی سے زیادہ حال ومستقبل کے بارے میں سوچنے لگی تھی ''اگر ابرار مجھے قبول کرتا ہے تو بچے کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے ۔ پھر وہ بچے کو چاہتا بھی تو بہت ہے ۔ مجھے تو اپنے بیٹے کی خوشی عزیز ہے ۔ اگر مستحکم سہارا اُسے میسر ہو جائے تو میرے ساجد کی زندگی' اس کا مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا ۔

ایک دن ابرار نے آتے ہی بچے کو گود میں اٹھالیا اور بڑے پیار سے چھاتی سے لگالیا ۔ اسے ایک عجیب سی کیفیت رینگتی محسوس ہوئی ۔ابرار بچے کی محبت میں اس کا طلبگار ہے ۔ وہ سوچنے لگی ۔لیکن وہ تو بیوہ ہے' ٹہنی سے ٹوٹا پھول ۔اس میں ایسی کیا کشش ہے؟ وہ تو خود اس قابل نہیں سمجھتی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام لے ۔اس کے خیالات واحساسات میں ہل چل مچ گئی ۔ حسین وپرکشش چہرہ لیکن بیوگی کا داغ لئے ہوئے ''وہ کنوارا اور میں ۔۔۔''

راسیہ نے اپنی موجودہ زندگی کو اپنی تقدیر مان لیا تھا ۔ جب بھی ابرار آتا اپنی محبت اور لچھے دار پرخلوص باتوں سے اتنا متاثر کر دیتا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکتی ۔ وہ ایک خوبصورت ڈبہ لایا تھا جس میں کانچ کا بنا تاج محل رکھا تھا ۔ وہ بچے کو مخاطب کر کے بولا ۔

''دیکھو بیٹا میں تمہاری ممی کے لئے کیا لایا ہوں؟''۔
معنی خیز انداز میں اس نے مسکرا کر ڈبہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ڈبہ دیکھ کر راسیہ کی آنکھوں میں چمک اُبھری ۔ وہ مسکراتے ہوئے بےخودی کے انداز میں کہنے لگی:
''اس کی کیا ضرورت تھی ۔میں اس کے قابل نہیں ہوں ۔
''تم کیا ہو ۔ یہ میں جانتا ہوں''۔ میرے پیار کے تحفہ کو قبول کر کے مجھے جینے کا حوصلہ دو۔مجھ پر بھروسہ رکھو ۔ میں تمہاری ویران زندگی میں خوشی کے پھول کھلانا چاہتا ہوں''۔

پھر وہ چلا گیا۔راسیہ حیرت وخوشی سے بت بن گئی ۔تاج محل محبت کی یادگار اس کے روئیں روئیں سے محبت چھلکنے لگی ۔دھڑکنیں تیز ہوگئیں ۔اس نے کھل کر کبھی پیار کا اظہار نہ کیا لیکن آج اس کی باتوں نے اپنی محبت اور چاہت کا اظہار کر دیا۔

دوسرے دن راسیہ اپنے دل میں خوش کن خیالات میں مگن کچن میں ساجد کی پسند کا حلوہ بنا رہی تھی ۔ یکا یک اسے ساجد کی ایک چیخ سنائی دی' وہ تڑپ کر باہر آئی ۔ بچے کے رونے کی آواز بالکنی سے آرہی تھی ۔بالکنی کے پاس آکر وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ۔ بچہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے رو رہا تھا اور ابرار اس کے قریب غصہ میں بھرا کھڑا تھا ۔ ماں کو دیکھ کر بچہ اس سے لپٹ گیا اور سسکیاں لینے لگا۔اس نے ساجد کو اٹھایا اور گلے لگا کر بولی:
''کیا ہوا بیٹے کیوں رو رہے ہو؟''۔
بچہ جواب دینے کے بجائے اور زور زور سے رونے لگا۔
ابرار غصہ سے کہنے لگا:
''بڑا بدتمیز بچہ ہے ۔ یہ دیکھو یہ تاج محل میں نے تمہارے لئے لایا تھا۔اس نے گرا کر توڑ دیا۔''
راسیہ نے فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھا ۔غصہ سے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں ۔
''تم ۔تم نے میرے بچے کو مارا۔؟
''میری بات سنو''۔
''میں کچھ سننا نہیں چاہتی ۔تم جیسے ہزاروں کو میں اپنے بچے پر سے قربان کر سکتی ہوں ۔ مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا ۔میرا بیٹا سلامت رہے ۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے ۔وہ بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔!!

درد وکرب سے اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا ۔نہ صرف کمرے کا بلکہ دل کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

## مضمون نگاران سے التماس

مضامین اور شعری کلام روانہ کرنے والوں سے التماس ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا نام' بنک پاس بک کی کاپی اور مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر و فون نمبر روانہ کریں۔ان شرائط کی تکمیل پر ہی آپ کی نگارشات قابل اشاعت ہونگی۔

ادارہ قومی زبان

☆☆☆

استوتی اگروال

# کہانی مل گئی.....

میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی ...کاش ! کوئی کہانی مجھے مل جائے ،جبکہ مجھے کہانیاں اطراف میں بکھری نظر آتی ہیں ،لیکن کچھ دنوں سے نہ ہی مجھے کوئی کہانی ملی اور نہ ہی اسے لکھنے کا کوئی mood ہوا۔ پتہ نہیں کیوں؟ بغیر کہانی لکھے میں بے چین رہنے لگی تھی ۔میں کہانی کی تلاش میں تھی اور سوچتی تھی آج اگر کہانی نہیں ملی تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی ۔میں نے کہانیوں سے لڑائی کر لی تھی اور اب میں ان سے کوئی دوستی نہیں کرنا چاہتی تھی، کیونکہ اکثر وہ مجھے بہت ستاتی تھیں اس لئے میں نے بھی سوچ لیا اور کہانی سے کہا....

''کہانی ! اگر تو اب مجھے نہیں ملی تو میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گی''۔

کہانی مجھے جواب دیتی اور کہتی ،''میں تو ہر طرف بکھری ہوئی ہوں بس تو مجھے لکھ دے ۔اب تو بتا میں تیری کیا مدد کر سکتی ہوں''؟۔

میں نے غصے سے کہا،''کہانی تو اب مجھ سے بات نہیں کرے گی ۔تو ہمیشہ مجھے گھوماتی رہتی ہے اور اپنی باتوں میں پھنسا لیتی ہے ۔اب میں تجھ سے خفا ہو گئی ہوں''۔

کہانی نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

ایک دن کی بات ہے میں اپنے گھر کی terris چھت پر بیٹھی ہوئی تھی ۔میں کہانی پر غصے میں تھی، نہیں تو میں اس سے اکثر باتیں کرتی رہتی تھی۔آج جب میں چھت پر تھی تو میں نے دیکھا میرے گھر کے سامنے والی حویلی کی کھدائی چل رہی تھی اور سبھی لوگ طرح طرح کی چیمہ گوئیاں کر رہے تھے ۔ کوئی کہتا یہ حویلی پتہ نہیں کیوں کھودی جا رہی ہے؟ کوئی کہتا اس حویلی میں بہت سارا خزانہ چھپا ہوا ہے ۔کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ میں سب کی باتیں دھیان سے سن رہی تھی ۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں ۔میری پڑوس والی آنٹی بھی میری ممی سے اس حویلی کے بارے میں ہی باتیں کر رہیں تھیں اور کہہ رہی تھیں..

''تمہیں پتہ ہے ..اس حویلی میں بہت سا سونا ہے اس لئے اس حویلی کو کھودا جا رہا ہے تا کہ وہ خزانہ مل جائے''۔

میری ممی نے آنٹی کی باتیں سن کر کہا،''ہاں...بھابی آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہو''۔

آس پڑوس کے سبھی لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میں بھی اُن کی باتیں سن رہی تھی ۔ پڑوس والی آنٹی نے کہا،'' چلو ! استوتی ....آج اپن حویلی دیکھنے چلتے

اگروال جیولرز
سرونج 464228 (مدھیہ پردیش)

ہیں۔ پتہ تو چلے اپنے سرونج میں بھی بہت سی اتہاسک جگہیں ہیں۔ چونکہ آنٹی ایک ٹیچر بھی تھیں اس لئے میں نے ان کی بات کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ میں آنٹی کے ساتھ حویلی میں جانے کے لئے بے چین ہوگئی۔

جیسے ہی حویلی کے اندر گئے بہت سی چمگادڑیں نکل کر آگئیں اور میں انہیں دیکھ کر بہت ڈر گئی کیونکہ مجھے چمگادڑ سے بہت ڈر لگتا ہے اور چمگادڑ کو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی اور میں زور زور سے چلانے لگی۔ ہم اور اندر جاتے گئے۔ وہاں پر ایک مزدور کھدائی کا کام کر رہا تھا۔ ہمارے گھر میں سبھی لوگ اندھوشواش کو بہت بڑھاوا دیتے ہیں۔ کبھی کسی دیوتا کی باتیں کرتے ہیں تو کبھی کسی کی ....آج بھی ایسا ہی ہوا۔ حویلی کے اندر پہنچتے ہی آنٹی مجھے بتانے لگیں کہ...

''استوتی، تمہیں پتہ ہے''۔

میں نے پوچھا، ''کیا آنٹی''؟

آنٹی نے کہا، ''اس حویلی میں ساکشات ناگ دیوتا موجود ہیں۔ وہ اس حویلی میں ہی رہتے ہیں اور اپنے خزانے کی رکشا کرتے ہیں''۔

میں نے کہا، '' آنٹی ! آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بھلا اس پڑھے لکھے دور میں ایسی باتیں کون کرتا ہے''؟

آنٹی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا، ''استوتی! تم پاگل تو نہیں ہو''۔

میں نے کہا، ''ارے آپ بھی نہ۔ میں نہیں مانتی ان باتوں کو''۔

اچانک سے پڑوس کے لوگ جو میرے ساتھ حویلی دیکھنے آئے تھے وہ بھی باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے....

''اس حویلی میں بہت سے ہیرے جواہرات ہیں اور اگر اس حویلی سے کچھ مل گیا تو مزے ہی آجائیں گے''۔

آنٹی نے پوری کہانی تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا، '' کیا ہوا تھا' سو سال پہلے یہاں بابا صاحب کا استھان تھا۔ وہ اپنے بھکتوں کی رکشا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ پہلے کے وقت میں سود پر لین دین بہت ہوا کرتا تھا اور سبھی لوگ مہاجنوں سے کچھ نہ کچھ رہن رکھ کر سود پر رقم لیا کرتے تھے۔ پہلے پیسہ نہیں چلتا تھا۔ بابا صاحب جنہیں ہم ناگ دیو مانتے ہیں' وہ پہلے سونے کے جھولے پر بیٹھ کر لین دین کیا کرتے تھے' وہ بہت ہی ایماندار انسان تھے۔ کبھی بھی کوئی مددگار ان کے دربار میں آکر مدد مانگتا تو وہ اس کی مدد کرتے اور اگر کوئی ایک چٹھی میں لکھ کر رات کو چھوڑ جاتا کہ اسے اتنے پیسوں کی ضرورت ہے تو اسے دوسرے دن پیسے مل جاتے تھے، لیکن اسے پورا پیسہ چکانا پڑتا تھا۔ یہی سلسلہ چلتا رہا، لیکن ایک بار کوئی لالچی شخص نے اپنی planning سے بابا کی جڑی ہوئی رقم بھی لالچ دے کر لے گیا اور پھر واپس نہیں آیا جس سے بابا کا کاروبار ٹھپ ہوگیا اور یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا''۔

جب میں نے یہ سنا تو میں اپنی ہنسی روک نہیں پائی اور بھاگتے ہوئے گھر آگئی۔ میں نے اسی بات کو گھر آکر قلم سے لکھ ڈالا اور کہانی کو آواز دے کر کہا '' کہانی تم آخر مجھے مل ہی گئیں''۔

☆☆☆

صلاح الدین نیر
حیدرآباد

# غزلیں

کب تک پیوں گا زہر میں‘ امرت میں گھول کر
مشکل میں پڑ گیا ہوں تمہیں اپنا بول کر

شاید ہو اس میں گردشِ دوراں کا کچھ علاج
پی لیجے زہرِ غم کو ذرا اور گھول کر

حرفِ غلط کی طرح مجھے دیکھتے ہیں لوگ
شرمندہ ہوگئے ہیں مجھے اپنا بول کر

ہوں مطمئن کچھ اچھی سی قیمت لگائیے
لایا ہوں اپنے شعر میں اشکوں میں تَول کر

ایک ایک لفظ ’غم کا‘ مرا ترجمان ہے
دل کی کتاب لایا ہوں پڑھئے گا کھول کر

باریک ہے نظر تو ذرا غور کیجئے
ہیرے نکال لایا ہوں موتی کو رول کر

رسوائیوں کا گرم ہے بازار ان دنوں
کچھ ہوگیا غلط ہے تو دل سے قبول کر

پہلے خود اپنی آپ حفاظت تو کیجئے
آتی نہیں ہے کوئی مصیبت بھی بول کر

اُس کو تو دشمنی کا سلیقہ نہیں رہا
پچھتا رہا ہوں اُس کو بھی میں اپنا بول کر

ظرف و ضمیر بیچ کے آیا ہے میرے پاس
شرمندہ کیوں رہوں میں تجھے اپنا بول کر

oOo

مجھ سے نہ تھا اُسے مری غزلوں سے پیار تھا
وہ شخص اجنبی تھا مگر غم گُسار تھا

پتھر کہاں سے آگئے لوگوں کے ہاتھ میں
اب کے برس بھی موسمِ گُل خوشگوار تھا

اُس کی ہتھیلیوں میں بھی کانٹوں کے زخم ہیں
جس کے گلے میں کل یہاں پھولوں کا ہار تھا

بیٹھا ہوا ہے وہ بھی مری آستین میں
سب سے زیادہ جس پہ مجھے اعتبار تھا

ہمت کہاں تھی مجھ میں اُسے دیکھتا رہوں
وہ تو الگ تھا سب سے‘ عجب طرح دار تھا

آنے میں اب کی بار بہت دیر اُس نے کی
اُس ایک چشمِ نم کو بہت انتظار تھا

پلکیں سفید ہوگئیں اک عمر کٹ گئی
تم کو میں یاد رکھوں مجھے اختیار تھا

کرتا تھا کل جو شہر میں پھولوں کے کاروبار
نیّر! وہی تو قاتلِ فصلِ بہار تھا

oOo

# غزلیں

ڈاکٹر سلیم عابدی
محبوب نگر

پلکوں پہ ہم اشکوں کو سجایا نہیں کرتے
دُکھڑا جو ہے دل کا وہ سنایا نہیں کرتے
یہ بات الگ ہے کہ بُھلا بیٹھا ہوں اُن کو
میں کیسے کہوں یاد وہ آیا نہیں کرتے
وہ جس کا ہے کردار مثالی تو یہ طئے ہے
مسجد ہو کہ مندر کبھی ڈھایا نہیں کرتے
جو راہِ صداقت پہ کبھی چل نہیں سکتے
دستورِ محبت وہ نبھایا نہیں کرتے
اخلاق کے مفہوم کا اندازہ ہے جن کو
لب پر وہ شکایت کبھی لایا نہیں کرتے
بدبخت ہیں احسان جو جتانے کے ہیں عادی
احسان جو کرتے ہیں جتایا نہیں کرتے
سرزد ہوئی کیا ہم سے خطا علم نہیں ہے
کیا بات ہے وہ سامنے آیا نہیں کرتے
گر آپ بلائیں گے تو آجائیں گے ورنہ
ہم آپ کے گھر کو کبھی آیا نہیں کرتے
وہ مان لیں اچھا ہے، مگر یوں بھی نہیں ہے
بے ساختہ ہم اُن کو منایا نہیں کرتے
اک بار یا دو بار کوئی بات نہیں ہے
ہر بار فریب آپ سے کھایا نہیں کرتے
ہم جب سے ملے آپ سے یہ وصف رہا ہے
جو بات ہے دل کی وہ چھپایا نہیں کرتے
اپنے تو سلیم اپنے ہیں خود ہم کو پتہ ہے
دل ہم کبھی دشمن کا دُکھایا نہیں کرتے

oOo

اپنے اخلاق کو سانسوں میں بسائے رکھنا
دل میں ایمان کی تم شمع جلائے رکھنا
اک چمن پیار کے پھولوں سے سجائے رکھنا
خار نفرت کے دِلوں میں نہ بچھائے رکھنا
آخرت کا تمہیں سودا ہے یقیناً لازم
اپنے دامن کو گناہوں سے بچائے رکھنا
روشنی لاکھ چراغوں میں جفا کی جو جلے
''اک چراغ اپنی وفاؤں کا جلائے رکھنا''
پستی مفلوج نہ کردے یہ رہے پیشِ نظر
قد گھٹانا نہیں قد اپنا بڑھائے رکھنا
خود بخود تم کو نظر آئے گی منزل اپنی
نیک راہوں پہ قدم اپنے بڑھائے رکھنا
میری رودادِ الم سُن نہیں سکتے نہ سہی
میں نے کب تم سے کہا کانوں میں پھاے رکھنا
کوسنا جتنا ہو تم کوس لو منہ پر میرے
مفت میں دل کو نہ تم اپنے دُکھائے رکھنا
اہمیت اُن کے ہر اک خط کو تمہیں دینی ہے
تم بھی الماری میں ہر خط کو چھپائے رکھنا
اُن کی یادوں کا یہ تحفہ ہے تمہیں یاد رہے
دل میں ہر زخم سلیقے سے سجائے رکھنا
میرا وعدہ ہے کسی دن میں چلا آؤں گا
بھول کر تم نہ کبھی مجھ کو بھلائے رکھنا
چار لوگوں میں سلیم اپنا جو پانا ہے مقام
اپنے کردار کو مضبوط بنائے رکھنا

oOo

ڈاکٹر رؤف خیرؔ
محبوب نگر

9-11-137/1
موتی محل، قلعہ گولکنڈہ 500 008 (تلنگانہ)

# غزلیں

لبھا رہی تو ہے دنیا چمک دمک کی مجھے
مگر حیات گوارا نہیں دھنک کی مجھے

ہمیشہ اپنی لڑائی مَیں آپ لڑتا ہوں
نہیں رہی کبھی حاجت کسی کُمک کی مجھے

بہت دنوں سے زمان و مکان حائل ہیں
کہ آس بھی نہ رہی اب تری جھلک کی مجھے

مرے قلم کی جو زد میں یہ بحر و بر آئے
دہائی دینے لگے نان اور نمک کی مجھے

مرا گمان، یقیں میں بدلتا رہتا ہے
سمجھنے والے بھلے ہی سمجھ لیں شکّی مجھے

چنانچہ گردشِ ایام تھک کے بیٹھ گئی
میں سخت جان ہوں کیا پیستی یہ چکّی مجھے

اسی لئے تو میں نمٹا رہا ہوں کام اپنے
میں جانتا ہوں کہ مہلت ہے آج تک کی مجھے

ادا کیا اسی سکے میں بے جھجک میں نے
ہوئی جہاں کہیں محسوس بو ہتک کی مجھے

خراب حال یہ بے خیرؔ و بے ادب ہوکر
بھٹک نہ جائے کہیں فکر ہے سڑک کی مجھے

oOo

زباں پہ حرف تو انکار میں نہیں آتا
یہ مرحلہ ہی کبھی پیار میں نہیں آتا

کھلے گا اُن پہ جو بین السطور پڑھتے ہیں
وہ حرف حرف جو اخبار میں نہیں آتا

سمجھنے والے یقیناً سمجھ ہی لیتے ہیں
ہمارا درد جو اظہار میں نہیں آتا

یہ خاندان ہمارا بکھر گیا جب سے
مزہ ہمیں کسی تہوار میں نہیں آتا

ہمارے حق میں تو وہ چاند اور سورج ہے
بہت دنوں سے جو دیدار میں نہیں آتا

کمال یہ ہے کہ ہم خواب دیکھتے ہی نہیں
کہ خواب دیدۂ بیدار میں نہیں آتا

ہمارا شعر سمجھنے کی کچھ تو کوشش کر
یہ کیا نوشتۂ دیوار میں نہیں آتا

قلم کی کاٹ تو تلوار سے بھی بڑھ کر ہے
مگر شمار یہ ہتھیار میں نہیں آتا

وہ اپنے ذوق بڑھائیں، اگر مزہ اُن کو
رؤف خیرؔ کے اشعار میں نہیں آتا

oOo

جہانگیر قیاسؔ
حیدرآباد

# غزلیں

اپنوں کا گھر آنا جانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
موسم شہر کا میرے سہانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
چاہت حد سے بڑھتی ہے تو دل کا عالم مت پوچھو
اُن کے جنوں میں دل دیوانہ اچھا مجھ کو لگتا ہے
کھا کے غذا میں مرغن کی کب تک چین سے رہتا ہوں یارو
روٹی چٹنی چین سے کھانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
اب تو اُن کی فرقت میں جینے کی عادت ہے مجھ کو
یاد میں اُن کی اشک بہانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
راہِ صداقت پر چلتا ہوں روزِ ازل سے میں لوگو
جھوٹی قسم کب میرا کھانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
مجھ کو تسلی حاصل کرنے یہ بھی اک سرمایہ ہے
اُن کو اپنے شعر سنانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
اُن کی اداؤں پر مرتا ہوں اُن کا ہے انداز الگ
اُن کا مچلنا اور شرمانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
چین سکوں سے جی لیتا ہوں مجھ کو کوئی فکر نہیں
میری غریبی کا یہ گھرانہ اچھا مجھ کو لگتا ہے
اُن کی آنکھوں میں جو چمک ہے دل میرے بھاتی ہے
اکثر اُن سے آنکھ ملانا اچھا مجھ کو لگتا ہے
اپنوں کی تو بات الگ ہے اپنے تو اپنے ہیں قیاسؔ
غیروں سے بھی ربط بڑھانا اچھا مجھ کو لگتا ہے

oOo

کیا زمانے سے مجھ کو پانا ہے
قبر جب مستقل ٹھکانہ ہے
دولت اب اُس سے بڑھ کے کیا ہوگی
غم کا سینے میں اک خزانہ ہے
زندگانی کا ایک مقصد ہے
دوستی آپ سے بڑھانا ہے
تھوڑے عرصہ سے شکر مالک کا
میرے گھر اُن کا آنا جانا ہے
کیوں نہ جاؤں ہر ایک محفل میں
نام مجھ کو اگر کمانا ہے
وہ ہمیشہ فریب دیتے ہیں
کام میرا فریب کھانا ہے
کاش وہ پاس میرے آجاتے
آج موسم بڑا سہانا ہے
چھاؤں اب مجھ کو کیا ضروری ہے
اُن کی زلفوں کا شامیانہ ہے
سیدھا سادہ میں ایک انساں ہوں
سیدھا سادہ مرا گھرانہ ہے
آرزو اپنی بس یہی ہے قیاسؔ
اُن کو اپنی غزل سنانا ہے

oOo